لاؤ تو قتل نامہ مرا

ایک نذرانہ ایک تجزیہ

تھک کر یونہی پل بھر کے لئے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

حسن میر

عبداللہ ملک

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

بار دوم ——— جنوری ۱۹۸۵ء

صفحات ——— ۲۲۴

قیمت ——— ~~۴۵/-~~ ۳۰ روپے

ناشر ——— کوثر پبلشرز لاہور

طابع ——— اکرا ایں پرنٹرز لاہور

کوثر پبلشرز ۱۳۴ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶

فون ـــ ۸۵۱۴۰۰

ترتیب

خطوط

اداریہ

تجزیہ

نذرانہ

تصاویر

وضاحت

ابتدائی طور پر یہ تجویہ اور نذرانہ فیض کی خدمت میں سترھویں سالگرہ کے لیے ترتیب دیا گیا لیکن اس کی اشاعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی اس لیئے کہ عبداللہ ملک پابند سلاسل ہوگئے بہرحال اس تاخیر کی پوری روئیداد حرف آغاز میں درج ہے لیکن کافی عرصے سے "لاؤ تو قتل نامہ مرا" کا پہلا ایڈیشن ختم تھا اور اس کی مانگ برابر بڑھتی چلی جارہی تھی چنانچہ اس کے دوسرے ایڈیشن کا اہتمام کیا ہی جارہا تھا کہ فیض صاحب کی موت نے ہاتھ روکنے پر مجبور کردیا اب عبداللہ ملک صاحب نے فیض صاحب کی موت پر ابتدائی صفحات تحریر کر دیئے ہیں اور ان کے ساتھ فیض صاحب کی موت پر لکھی جانے والی کچھ نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

اب نئی ترتیب کے ساتھ یہ "لاؤ تو قتل نامہ مرا" پیش خدمت ہے۔

اے۔ ایم۔ ملک
مینجر کوثر پبلشرز
یکم جنوری سنہ ۱۹۸۵ء

طبع دوم کا حرفِ آغاز

عبداللہ ملک

ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے

یہ ۱۹۸۴ء کا سال تھا اور نومبر کا مہینہ تھا، وہی نومبر جس میں ہلکی ہلکی خنکی ہوتی ہے اور خزاں کی پت جھڑ شروع ہوتی ہے۔ اسی پت جھڑ کے موسم میں ایک تناور درخت سایہ دار درخت دیکھتے دیکھتے زمیں بوس ہو گیا۔ یہ وہ درخت جس کے سایہ میں تین نسلوں نے اپنی زندگی بنائی تھی، اس کی چھاؤں میں دم لیا تھا اس کے پتوں کی لو باس سے اپنے مستقبل کے خوابوں کو سنوارا تھا۔ اپنی زندگی کی تاریک راہوں کو منور کیا تھا۔ اور پھر ۲۰ نومبر کی ایک دوپہر کو یہ تناور درخت جس کا نام فیض احمد فیضؔ تھا وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کو روتا چھوڑ کر چل دیا۔ لاکھوں کروڑوں کے پیارے سے دامن جھٹک کر چل دیا اور وہ روتے رہ گئے، اسے یاد کرتے رہ گئے اور نہ جانے کب تک ایک عالم اس کو یاد کرتا رہے گا کیونکہ فیض کسی ایک شخص کا نام نہیں تھا۔ وہ ایک زندہ و تابندہ تحریک تھا وہ امیدوں اور آرزوؤں کا مظہر تھا وہ مجبوروں اور مقہوروں کی مزاحمت کا نشان تھا وہ درخشاں مستقبل کی نوید تھا اور ان گنت سہانے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اور یہ تمام خواب ۱۹۸۴ء کے نومبر کی ایک دوپہر کو چکنا چور ہو گئے اور فیض احمد فیض کو جو عظیم شاعر تھا جس کا ہر شعر ایک عظیم جدوجہد کا پرتو تھا تو ۲۰ نومبر کی دوپہر کو ہزاروں انسانوں نے سسکیوں اور مالا دیتوں کے ساتھ اسے لحد میں اتار دیا اور یہ وہ وقت تھا جب مزدوروں نے محنت کشوں نے سرخ پرچم تھامے نعرہ بلند کیا تھا "فیض امر ہے" "فیض زندہ ہے" "فیض ہمارا ہے۔"

یہ نعرے ایک نئے عزم کا اظہار تھا وہ عزم جسکو کبھی موت نہیں آتی، جس کا شعلہ کبھی سرد نہیں پڑتا اور امید کی یہ مشعل جس کو فیض کے شعروں نے ان گنت انسانوں کے دلوں میں روشن کیا تھا وہ آج بھی روشن ہی نہیں بلکہ اس کی روشنی اور زیادہ روشن اور تابندہ ہو گئی تھی۔

مشعلیں لے کے تمہارے غم کی
ہم اندھیروں میں چلا کرتے ہیں

فیض کی شاعری مزاحمت اور امید کی شاعری ہے جو اس برصغیر کے مخصوص حالات کی کوکھ سے پھوٹی ہے اور اس برصغیر کے بسنے والوں کی خواہشوں اور تمناؤں نے اس کو پروان چڑھایا تھا۔ اس عالمِ رنگ و بو کے ان گنت انسانوں کی جدوجہد نے اس کو نکھارا تھا اور غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش نے اس کے اشعار کو ان گنت نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا تھا اور آج جب اس واردات شعری کو قریب قریب نصف صدی گزر گئی ہے تو ہر دن کے ساتھ فیض کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوا ہے اور ایک جہد مسلسل نے اس کو تین نسلوں کا محبوب شاعر بنا دیا تھا۔ فیض کی جدوجہد کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ناطہ عالمی جدوجہد سے جڑا ہوا تھا اسی جدوجہد کے دوران اس نے مزاحمت اور امید کا پرچم بلند کیا اور اس نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اسی مزاحمت اور امید کی تخم ریزی کی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی لوگ ظلم کے خلاف مصروف پیکار ہوتے ہیں وہاں فیض کی شاعری ان مصروف جہد انسانوں کا رجز اور ترانہ بن جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ فیض کی ذات کے تمام پہلو اسی مزاحمت اور امید ہی کے مظہر تھے۔ میں نے فیض کی شاعری کو مزاحمت اور امید کی شاعری کہا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس کے خلاف مزاحمت؟ یہ مزاحمت تھی اس برصغیر کو غلام بنانے والے برطانوی سامراج کے خلاف یہ مزاحمت تھی غریبی اور جہالت کے خلاف یہ مزاحمت تھی بیروزگاری اور فاقہ کشی کے خلاف لیکن اس مزاحمت کے بھی کچھ نمایاں پہلو تو یہ ہے کہ فیض ایک درمیانہ طبقہ کے اشرافیہ خاندان کا فرد تھا، اور علم ہمارے ہاں اسی طبقے کو میسر تھا اور اردو زبان کا ورثہ بھی اسی اشرافیہ کے لیے تھا۔ اور اسی اشرافیہ کے نوجوان اس برصغیر کی سیاسی جدوجہد کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے انہوں نے ہی سب سے پہلے عوام کو منظم کرنے ان کو ان کے سیاسی شعور دینے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب عالمانہ اور فلسفیانہ تھا۔ اس لیے اس دور کی مزاحمتی شاعری میں بھی وہی اسلوب رائج تھا، چنانچہ فیض کے پیشرو برصغیر کے عظیم شاعر علامہ اقبال کا اسلوب بھی یہی تھا۔ اسی لیے ہم ان کو فلسفی بھی

تصور کرتے ہیں دراصل فیض اقبال کے قبیل کے ہی شاعر ہیں۔ اس کی عظمت کے ورثے سے انہوں نے نہ صرف پورا استفادہ کیا ہے بلکہ وہ اس کو لے کر آگے بڑھے ہیں اور یہی خاصیت ان کو اپنے پہلے کے ادوار اپنے زمانے کے شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔

فیض نے مزاحمت کے لیے باقاعدہ ایک فلسفہ، ایک نظریئے، ایک راہ عمل کو اپنایا اور اسی نظریے اور راہ عمل نے ان کے اندر امید کی ایسی شمع روشن کی جو طوفانوں اور آندھیوں سے بھی بجھائے نہ بجھ سکی۔

اور یہی وہ مربوط اور گندھا ہوا فلسفہ تھا جو فیض کو اقبال سے ممیز ہی نہیں کرتا بلکہ اس کو اس سے اگلی صفوں میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ یہاں اقبال اور فیض کا تقابل مقصود نہیں ہے۔ اور نہ ہی فیض کی برتری منوانا مقصود ہے بلکہ ایک حقیقت کی نشاندہی کرنا ہے، اور اس امر کی وجہ بہت واضح ہے کہ اقبال کی شاعری کئی ایک اور گنجلک ادوار کو احاطہ کیے ہوئے ہے ان ادوار میں برصغیر کے بسنے والے کسی مربوط فلسفے کی تلاش میں سرگرداں اور مسلسل مصروف تھے، منزلوں کا تعین بھی ابھی پوری طرح نہ ہو پایا تھا لیکن فیض کی شاعری ایک زیادہ واضح دور کی عکاسی کرتی ہے ایک ایسے دور کی جب مارکسزم ایک زندہ اور خوش آئند مستقبل کا نظریہ بن کر اس عالم کے مظلوم، غلام اور مقہور انسانوں کو متاثر کر رہا تھا اس لیے فیض کو ایک فلسفہ اور ایک نظریہ اپنانے میں وہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے جو ان کی پہلے کی نسلوں کا مقدر تھا، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے بعض اشعار عوام دشمن دانشور غلط انداز میں استعمال کر کے اس کو جمہوریت کے مخالفین کی صفوں میں کھڑا کر دیتے لیکن فیض کا کلام پورے حملوں کے باوجود اس محاذ پر شکست نہیں کھائے گا اور اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا اپنے نظریہ حیات پر یقین محکم ہے لیکن فیض کا فلسفہ کیا تھا؟ اس کا نظریہ کیا تھا؟ اس کی وضاحت خود فیض نے لینن امن انعام وصول کرتے ہوئے کی تھی۔ فیض نے کہا تھا۔ "لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے لینن جو دور حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرط اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر

نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایان شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کی وابستگی رہی ہے یعنی لینن امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت واکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔"

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِعمل اور برسرِپیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں، تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے بھی فرق ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں ابنِ آدم کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے۔ انہیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی

کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکیں. اس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے، لیکن اب یہ صورت نہیں ہے. اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں. بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن، بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکینِ ہوس کے لیے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لانے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں، لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوس، استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برادری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اُٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں، عملی کام ہے۔ اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ تر عزیز ہے۔ جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے سیاست واخلاق، ادب اور فن۔ روزمرہ زندگی، غرض کئی محاذوں پر، کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لیے ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں

کی لازمی کش مکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی شدید اختلاف موجود ہیں۔ جنہیں حال ہی میں آزادی ملی۔

ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امنِ عام اور انسانی برادری کی دوستی اور یکانگت کو پسند نہیں کرتی۔ اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا ہی لازم ہے۔"

یہ اقتباس اس امر کا شاہد اور بین ثبوت ہے کہ فیض اس طبقاتی سماج میں ایک جانبدار ذی نفس تھا اور وہ کھلم کھلا اپنے اس آدرش کا اظہار کرتا رہا ہے اور اس میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا اور اس امر سے وہ بے نیاز رہتا تھا کہ حاکم طبقے اس سے کس قدر تلملا ئیں گے اس لیے آج جب اس کو ایک غیر جانبدار مرنجاں مرنج انسان کا لقب دیا جاتا ہے تو یہ لقب دینے والے دراصل اس کی عوام دوست محنت کشوں کی حمایت اور ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لیے اس کے آدرش عقیدے اور والہانہ محبت کے نشتروں کی چبھن کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں وہ شریف النفس ضرور تھا لیکن شرافت کا مطلب عوام دشمن طبقوں کی حمایت اور محبت نہیں تھا، وہ ان طبقوں کے خلاف اپنی بھرپور نفرت اور غیض و غضب کا اظہار کرتا رہا ہے، یہ اسی عوامی غیض و غضب کا اظہار تھا جس نے اسے یہ کہنے پر مجبور کیا۔

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے\
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے\
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں\
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے۔

وہ کارل مارکس کے فلسفے کو تسلیم کرتا تھا وہ طبقاتی کش مکش میں یقین رکھتا تھا اس کا تاریخی جدلیات پر پختہ یقین تھا اور اس کی شاعری میں طبقاتی کش مکش کے بے حد ہی دلکش اور مؤثر نمونے مل جاتے ہیں اور طبقاتی کشمکش کے ذریعے وہ عدم طبقاتی سماج تک پہنچنے کے عمل کا بھی وہ جگہ جگہ اظہار کرتا ہے،

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سِیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کار گہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

اب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھائے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

اِن دونوں میں رن پڑتا ہے
نِت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

اس لیے آج جب ہم فیض کو یاد کرنے، اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے، اس کی عظمت کے گن گا رہے ہیں تو اس کا بنیادی آدرش اور اس کا فلسفۂ زیست آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، کیونکہ یہی وہ نظریہ تھا جس کی مشعل تھامے وہ تمام عمر جبر و ظلم کے خلاف معروفِ پیکار رہا۔ اس نے اس جہاد میں صرف قلم کو ہی استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے لیے ہر ہتھیار اور ہر محاذ جو اس جہاد میں کامیابی کی طرف لے جانے مقدس ٹھہرا تھا۔ اس نے مزدوروں کو منظم کرنے کے لیے اپنی زندگی کے کئی سال وقف رکھے، وہ آل پاکستان ٹریڈ یونین کا مدتوں نائب صدر رہا اور عالمی کانفرنسوں میں پاکستانی مزدوروں کی نمائندگی کرتا رہا۔ وہ پاکستان بھر کے ڈاکیوں یعنی پوسٹل ورکرز کی یونین کا صدر رہا۔ اس نے صحافت بھی کی اور مرحوم پاکستان ٹائمز اور

امروز کا سالہا سال چیف ایڈیٹر رہا پھر اس نے آرٹ اور کلچر کے لیے دن رات ایک کیے اور جب میاں اپنے ملک کچھ کرنے کو نہ رہا تو افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں کے محاذ پر وہ مصروف عمل ہو گیا اور ان کے رسالے لوٹس کی ادارت سنبھالی اور اسی ضمن میں اس نے بیروت میں یاسر عرفات اور اس کے فلسطینی مجاہدوں کے دوش بدوش مصروف جہد رہا۔

اس لحاظ سے آج ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم فیض کے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس پر کام کریں یہ تمام پہلوؤں کا میں نے ذکر اس لیے کیا ہے کہ ایک طبقاتی سماج میں ظالم اور مظلوم ایک دوسرے کے خلاف مصروف پیکار ہوں، جہاں آزادی کے لیے جہاد ہو رہا ہو تو ظالم طبقہ صرف اپنی سنگینوں سے ہی لیس ہو کر ان گنت مظلوموں، مجبوروں اور مقہور انسانوں پر حملہ آور نہیں ہوتا بلکہ وہ مجبور اور مقہور انسانوں کے ذہنوں کو بھی مفلوج کرنے ان کو غلط تعلیم دینے، ان کو توہمات کے گورکھ دھندے میں پھنسانے کے لیے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا، ہمارے ہاں قائد اعظم ہوں یا اقبال ان کے ساتھ یہ قطع و برید کا عمل جاری ہے اور ان کے کلام سے روزمرہ جمہوریت دشمنی کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں اور اس میں حکمران طبقے اور ان کے حالی موالی دانشور بظاہر کامیاب بھی نظر آتے ہیں اس لیے کہ تمام ذرائع پر ان کا تصرف ہے ٹیلی ویژن ان کا، ریڈیو ان کا، اخبارات ان کے، تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ یہ مسلسل جھوٹ بول کر اس کو سچ بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور اس طرح سے حکمران طبقے نے قائد اعظم" اور اقبال" کو عوام دشمن صفوں میں کھڑا کرنے کی جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔

اس لیے آج نوجوان نسل پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تحقیق اور جستجو کا دامن مضبوطی سے تھامے اور اپنے ارد گرد جو بھی چھپا ہوا لفظ اخبار کی صورت میں یا تصویری زبان میں ٹیلی ویژن کے ذریعے آپ تک پہنچے، یا پھر ریڈیو کی آواز کے ذریعے آپ سُن پائیں ان سب کو تحقیق اور تفتیش کے ترازو پر ضرور تولیں، ان پر بحث کریں ان میں جھوٹ کا عنصر بہت غالب ہو گیا تھا ملی سطح پر جیسے جیسے حکمران کمزور ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی ان کے جھوٹ، فریب اور دغا میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور کچھ حلقوں کی طرف سے

فیض کو بھی عوام سے چھیننے کی کوشش شروع کی گئی لیکن ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فیض کو عوام دشمن صفوں میں کھڑا کرنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوگی اس لحاظ سے وہ شاید ان مظالم سے محفوظ رہ جائے جن کی زد میں قائداعظم اور علامہ اقبال آئے ہوئے ہیں اور روزانہ جید عالم اور دانشور ان کو جمہوریت کے مخالف ظاہر کرنے پر مصر رہتے ہیں۔

ہاں آخر میں ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں کہ جس انداز سے پاکستان کے مختلف حلقوں نے فیض کی موت پر سوگ منایا ہے اور اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ چند برس پہلے جس طرح کچھ مفاداتی حلقوں نے فیض کی ذات اور اس کے نظریات کو متنازعہ بنایا تھا اور اس پر ملامت کے ڈونگرے برسائے تھے آج معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلقے خود ہی کچھ شرمندہ شرمندہ نظر آتے ہیں اور اب وہ بھی فیض کو خراج پیش کرنے میں نظر آرہے ہیں یہ خوشی کا مقام ہے کہ پاکستان کے عوام کے ہر طبقے نے طبقاتی بُعد کے باوجود فیض کے نظریات اور اس کے کلام کے عظمت کو تسلیم کیا ہے اس سے ایک حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آج کے پاکستان میں سیاسی اور اجتماعی گھٹن نہ ہونے کے باوجود فیض کے کلام کو جو شرفِ قبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اس دور میں مزاحمت اور احتجاج کی ضرورت کی نشاندہی کرتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اسی ضمن میں استاد دامن کی موت بھی ہمیں رہ رہ کر رلاتی ہے اور اس موقع پر ہم حبیب جالب کی زندگی کی دعا میں کرتے ہیں اس لیے کہ اب وہ مزاحمتی شاعری اور احتجاج کا نشان ہے۔ اللہ تعالےٰ اس نشان کو تادیر مزاحمت کی مشعل روشن رکھنے کی ہمت دے، صحت دے اور زندگی دے۔

حرفِ آغاز

فیض احمد فیض پاک و ہند کے عظیم شاعر ہیں۔ ان گنت ان کے چاہنے والے ہیں۔ کون ہے جو اردو داں ہو اور فیض سے ناواقف ہو۔ مدت ہوئی جب ان کی شہرت اس برصغیر کی سرحدیں عبور کر کے ایک عالم کی میراث بن گئی تھی، یہ ان کی عالمی مقبولیت و محبوبیت ہی کا تقاضا تھا کہ ان کی پچاسویں، پھر ساٹھویں، پھر پینسٹھویں سالگرہوں کی تقریبات عالمی سطح پر منائی گئیں۔ افریقہ ہو یا ایشیا، یورپ ہو یا لاطینی امریکہ ملک ملک اور شہر شہر جلسے ہوتے جہاں فیض کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور پچھلے سال ۱۳ فروری ۱۹۸۱ء کو جب فیض ستر برس کے ہوتے تو پھر جشن بپا ہوتے۔ دیس دیس، شہر شہر اور قریہ قریہ لوگ اکٹھے ہوئے، جلسوں کا اہتمام ہوا، مقالے پڑھے گئے اور شعر سنے گئے سنائے گئے غرضیکہ اس عالم دلفریب کے کروڑوں انسانوں نے اس عظیم شاعر کو اس موقعہ پر ہدیہ تبریک پیش کیا۔ اسکی درازیٔ عمر کی دعا کی یہ اوراق بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ یہ بھی فیض کے حضور میں ایک نذرانہ عقیدت ہے فیض کے عشاق کی قطار زلفِ یار کی طرح دراز ہے اور ان کی تعداد ان گنت ہے اور میں فقیر بھی اسی قطار میں کھڑا ہوں اور ان اوراق کی ترتیب بھی اسی عشق کا اظہار ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فیض کے بہت زیادہ قریب ہوں۔ نہ ہی ان اوراق کو میں نے اس لیے مرتب کیا ہے کہ اس سے اپنی قربت کا رعب جماؤں۔ یہ تو اس کی فکر، اس کی شاعری، اس کی عوام دوستی اور ان راہوں میں اس کی

استقامت کو ایک خراج ہے جو ہر حساس انسان اپنے اپنے انداز میں ادا کرتا رہا ہے گا۔

ان اوراق کو میں نے ترتیب تو دیا تھا فیض کی سترویں سالگرہ کے لیے لیکن ان کی اشاعت ایسے وقت میں ہو رہی ہے جب وہ اکہتر برس کے ہو گئے ہیں پچھلے سال یہ اس لیے شائع نہ ہو سکے کہ ۸ مارچ ۸۱ء کو میں بھی ہجوم یاراں کے ساتھ کوٹ لکھپت جیل میں مارشل لاء کے تحت نظر بند کر دیا گیا لطف یہ ہے کہ فیض کی سترویں سالگرہ کی تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں جو لوگ بھی سرگرم تھے ان کی اکثر سب کوٹ لکھپت جیل میں یکجا ہو گئی اور ۱۳ فروری ۱۹۸۱ء کو فیض کی درازی عمر کے لیے جو جشن اس روشنیوں کے شہر لاہور کے ہلٹن ہوٹل میں بپا ہوا تھا اس جشن کی باقیات ہم کافی دنوں تک زنداں کی دیواروں کے پیچھے مناتے رہے۔

فیض کی سالگرہ کے سلسلے میں جو تقریب منعقد کی گئی اس کے سٹیج سیکرٹری پاکستان کے نامور اداکار اور ہمارے دوست محمد علی تھے چنانچہ وہ دھر لیے گئے جس وقت اس تقریب کا دوسرا دور شروع ہوا اور اقبال بانو نے اپنی موسیقی اور رس بھری آواز سے مجمع کو مسحور کرنا شروع کیا تو اعلانات کی ذمہ داری پیارے حمید اختر نے سنبھال لی سو وہ بھی دھر لیے گئے مقالہ پڑھنے والوں میں پروفیسر امین مغل تھے وہ بھی پابندِ سلاسل ہوتے ایک مقالہ میں نے پڑھا میں بھی ان کا رفیق ٹھہرا حبیب جالب نے نظم پڑھی وہ بھی جیل میں ہمارا میر کارواں بنا۔ غرضیکہ جیل میں روز ہی جشن فیض منایا جانے لگا۔ کیونکہ اس دفعہ جیل میں فیض کے عشاق کا ایک ہجوم تھا ان میں یہاں محمود علی قصوری تھے، راؤ رشید تھے ڈاکٹر مبشر تھے، مظہر علی خاں تھے اور آئی اے رحمان، رضا کاظم تھے، میاں نعمت اللہ تھے، ظفر ملک تھے اور پھر عید منانے کے بعد جیل میں اتھل پتھل شروع ہوئی اور بہت سے لوگوں کو کوٹ لکھپت جیل سے دوسری جیلوں میں منتقل کیا گیا اور کچھ کو دوسری جیلوں سے یہاں لایا گیا تو اعتزاز احسن ملتان سے کوٹ لکھپت آ گئے فاروق لغاری ساہیوال سے لائے گئے۔ آصف وردگ بہاولپور سے پھر کیمپ جیل سے خورشید قصوری کچھ دنوں کیلیے لائے گئے اور کئی اور دوست یہاں لائے گئے۔ یہ سب اپنے اپنے گناہوں کے لیے لائے گئے تھے لیکن فیض سے عشق ایک قدر مشترک تھا اور اس عشق کا مشغلہ

اس وقت اور بھی بھڑک اٹھا جب فیض کا یا مجموعہ کلام میرے دل میرے مسافر جیل کے اندر پہنچا اور اس کی پہلی نظم "دل من مسافرِ من" نے رُلا رُلا دیا کیونکہ یہ ہر زندانی کے حسب حال تھی۔

نظم۔ دلِ من مسافرِ من

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
جو ملا نہ کوئی پرساں
ہم التفات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے

ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

اگست سنہ ۸۱ء میں رہا ہوا جیل جانا ایک مصیبت ہوتی ہے اور کچھ وقت وہاں کے ماحول سے اپنے کو مانوس کرنے میں لگتا ہے اور جب وہاں مانوس ہو جاتے ہیں تو پھر رہائی کا حکم صادر ہو جاتا ہے اور باہر کی دنیا غیر مانوس لگنے لگتی ہے اور جیل کے معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں پھر نئے سرے سے باہر کی دنیا سے مانوس ہونے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے چنانچہ اسی تگ و دو میں خاصا وقت گزر گیا اور ان اوراق کی اشاعت ملتوی ہوتی رہی۔

اتنے میں فیض ایک بار پھر ملکی اور عالمی سطح پر خبروں کا موضوع قرار پائے ہوا یوں کہ ان کو جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو میں ادیبوں کی ایک عالمی کانفرنس کے لیے مدعو کیا گیا چنانچہ وہ بیروت سے عازم ٹوکیو ہوئے اور راستے میں کراچی ایک رات ٹھہر گئے اس لیے کہ یہاں سے ان کو جاپان ایئرلائنز کا طیارہ پکڑنا تھا۔ چنانچہ اسی کراچی کے دوستوں سے ملاقات ہوئی میر رسول بخش تالپور جو فیض کے خاصے گہرے دوست ہیں نے ان کو کھانے پر مدعو کیا اور کراچی اور لاہور میں حلقہ فیض میں ہنگامہ بپا ہو گیا کہ فیض آگئے بہر حال جس کو موقع ملا اس نے ان سے ملاقات یا ٹیلی فون پر ان کی آواز دلپسند سنی مگر اصل ہنگامے کا اس وقت پتہ چلا جب بی بی سی نے یہ خبر نشر کر دی کہ فیض کو ملک سے باہر جانے سے روک دیا گیا۔ صبح کے اخبارات میں بھی یہ خبر چھپ گئی اب جتنے منہ اتنی باتیں لیکن اس خبر نے عالمی سطح پر بھی ہنگامہ بپا کر دیا۔ تمام عالمی اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع کی اور مختلف تنظیموں کی طرف سے صدر مملکت کو احتجاجی تار موصول ہوئے تنظیم فلسطین کے سربراہ جناب یاسر عرفات نے خود ایک ذاتی مراسلہ صدر مملکت کو ارسال کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور دوسری رات فیض کو ٹوکیو جانے کی اجازت مل گئی۔

اس ایک رات کے قیام کے دوران فیض سے ٹیلی فون پر محترمہ آمنہ مجید ملک کے ہاں جہاں وہ ٹھہرے تھے گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کہ فروری تک لوٹوں گا چنانچہ اس مژدہ جانفزا کے بعد سوچا کہ حالات نے جو کام کھٹائی میں ڈالے رکھا ہے اب اس کو فروری ۸۲ء تک تو مکمل ہو جانا چاہیے چنانچہ اب جب پھر سال گریز کو ہے اور ۸۱ء کا سال دم توڑ رہا ہے اور فیض اکہتر برس کے ہو گئے ہیں تو پھر ان کتابت شدہ اوراق سے گرد جھاڑ کر صاف کرنے بیٹھا ہوں۔

ان اوراق کے بارے میں عرض ہے کہ کچھ دوستوں محمد علی، امین مغل اور میرے ایسے مضامین سے زیادہ اس میں فیض کی اپنی نگارشات سے میں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کے فلسفے کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے مثلاً ان کا فلسفہ ریاست، سیاست، ادب، کلچر وغیرہ کے بارے میں ان کے نظریات، اسی طرح سے ٹریڈ یونین سے ان کی دلچسپی ہے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں ان کے خیالات ہیں ان کے اپنے الفاظ میں جمع کر دیئے ہیں اسی طرح سے ان کے حالیہ خطوط بھی دے دیئے ہیں ان خطوط میں زیادہ خطوط اپنی چھوٹی بیٹی منیزہ ہاشمی کے نام ہیں اور کچھ خطوط دوستوں کے نام ہیں۔

ایک حصہ ان کے تازہ ترین کلام پر مشتمل ہے اور پھر ایک حصہ مختلف یادگار تصاویر پر مشتمل ہے پہلے میں نے ارادہ کیا تھا فیض پر انگریزی میں جو کام ہوا ہے اور خود فیض نے جو تحریریں اور صحافت انگریزی میں کی ہیں وہ بھی اس میں شامل کر دوں لیکن بعد میں سوچا کہ انگریزی نگارشات الگ سے شائع ہونی چاہییں سو انشاءاللہ جلد ہی یہ بھی کام کر لوں گا۔

بہرحال اپنی طرف سے کام مکمل کر رہا ہوں لیکن کون جانتا ہے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے آخر کام نو مارچ ۱۹۸۱ء میں بھی تکمیل کے قریب تھا لیکن قدرت کو منظور نہ ہوا اس لیے اب وثوق سے کہنے والا میں کون ہوتا ہوں۔

اس کے تو شاید ایسی ٹھہری وہ سارے زمانے بھول گئے۔

عبداللہ ملک ۱۶ دسمبر ۸۱ء

نذرِ فیض

فیض اور فیض کا غم بھولنے والا ہے کہیں
موت یہ تیرا ستم بھولنے والا ہے کہیں

ہم سے جس وقت نے وہ شاہِ سخن چھین لیا
ہم کو وہ وقتِ الم بھولنے والا ہے کہیں

اپنے اشکوں اور بھی چمکائیں گے یادیں اس کی
ہم کو وہ دیدۂ نم بھولنے والا ہے کہیں

کبھی زنداں میں کبھی دور وطن سے اے دوست
جو کیا اس نے رقم بھولنے والا ہے کہیں

آخری بار اسے دیکھ نہ پائے جالب
یہ مقدر کا ستم بھولنے والا ہے کہیں

جالب

دوپہر میں غروب کا منظر

کشور ناھید

ماتم کی آواز نے میرا سارا وجود پہنا ہُوا ہے
اور میرے اندر، پرچھائیاں بھی معدوم ہونے لگی ہیں ۔
میرے خوابوں نے طلوع ہونا
اور میری تعبیروں نے زندگی پانا چھوڑ دیا ہے
شام اور رات کے بیچ، اندھیرا لانے والی
پرچھائیں کو کس نے دیکھا ہے ۔
مگر وہ تو بھری دوپہر تھی
سورج ہمارے وجود کو ننگا کر کے
ضرب لگا رہا تھا
ہم کہ جنہیں بہت مار کھانے
بہت ذلتیں سہنے
اور بہت سی ہزیمتیں برداشت کرنے کی عادت ہے
ہم، اپنی تمام تر بزدلی کے باوجود
شہر کے دوسرے کنارے سے آنے والی
رونے کی آواز میں آواز ملا کر
رو رہے تھے ۔
ہمارے بے آواز ہونٹ
ہمارے بے شباہت چہرے
ہمارے بے سماعت کان
بے بدن ہوا کی طرح
وحشتوں کے کواڑ پیٹ رہے تھے
ہمارے سپنوں کی آبائی بستیوں کا مکین

ہم سے رخصت ہو رہا تھا
ہمارے لڑکپن کو اس نے خواب آشنا کیا تھا
اور ہمارے خوابوں کی مانگ میں
تعبیر کا سندور بھی اُس نے ہی لگایا تھا
اس زمین کی فصلوں کے قہقہوں سے
اس کی آنکھیں جاگتی تھیں
اور اس زمین کی کھُلی ہوئی کھڑکیاں
اس کے لئے روشنی تھیں
وہ نہ مانگتا تھا، نہ التجا کرتا تھا
وہ نہ وحشتیں پہنتا تھا
نہ جنوں بوتا تھا
مگر ہم سب کے جنوں کا مداوا، وہی تھا
اس کو سناٹوں سے بھی بات کرنی آتی تھی
اور طوفانوں سے بھی
اس کی صحراؤں سے شناسائی بھی تھی
اور دریاؤں سے بھی
ہمارے اعمال کی سیاہیاں دھونا
اور ہمارے بیمار امروز کی مسیحائی کرنا
اس کا شیوہ تھا
سمندروں کی گہرائیاں بھی اب ہماری
آنکھوں میں آ بھی جائیں۔
تب بھی ہم اُسے انہیں ڈھونڈ سکتے ہیں
ماتم کی آواز نے ہمارا سارا وجود پہنا ہوُا ہے
اور ہمارے اندر پرچھائیاں بھی معدوم ہونے لگی ہیں۔

فیض کے فراق میں

احمد فراز

اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں

ہر سال

اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
تیری کویتا میری تیری دھرتی کی سچائی
تیرے بول ہیں سارے گونجے شہروں کی گویائی
تیرے گیت ہیں امن کی لَے اور آشتی کی شہنائی
آنگن اور چوپال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال

اے ماٹی کے لال

کوئی تجھے دُنیا اپنائے لیکن اپنا شہر
اپنا شہر کہ حدِ نظر تک جیسے لہُو کی نہر
یا منصُور و مسیح کی سُولی یا سُقراط کا زہر
ہم آشفتہ حال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں ہر سال
اے ماٹی کے لال
ہجر کی رت کتنے روز رہے گی
اور فقط کچھ روز
وصل کی ساعت آ پہنچے گی
اور فقط کچھ روز
راہ کی ہر دیوار گرے گی
اور فقط کچھ روز
گلے میں باہیں ڈال تجھے سب یاد کریں
اے ماٹی کے لال
تجھے سب یاد کریں
تجھے سب یاد کریں

فیض کی یاد میں

: جاوید شاہین

جس سے لگا ہُوا تھا یہ میلہ کہاں گیا
رونق پسند عشق تھا تنہا کہاں گیا

سب کے جگر میں اتری کرن رہ گئی کہاں
جو تھا نشانِ صبح وہ تارا کہاں گیا

اب ظالموں سے میرا مقدمہ لڑے گا کون
انصاف کے حصول کا وعدہ کہاں گیا

ہاتھوں میں رہ گئی ہے فقط تشنگی کی ریت
وہ بہہ رہا تھا سامنے دریا کہاں گیا

مشکل ہُوا ہے دیکھنا دیوار دل کے پار
سچائی کی طرف کا دریچہ کہاں گیا

ٹھٹھرا ہُوا بدن لئے پھرتا ہوں شہر میں
اِن سردیوں میں دھوپ کا خطہ کہاں گیا

اب جسم کے نواح میں بکھری ہوئی ہے راکھ
دل سے نکل کے درد کا شعلہ کہاں گیا

خطوط

فیض بنام م ش

FAIZ AHMED FAIZ

POST OFFICE BOX NO 135/430
BEIRUT
LEBANON

۲۲ فروری ۸۱ء

محترمی میاں شفیع، السلام علیکم

شاید صحیح ہو کہ آپ حسبِ وعدہ ملاقات جس کا جواب لکھ دیتا ہوں۔ اس بار ۔۔۔ میں
کیا اصطلاح سے گزر کر اللہ میں کچھ لکھیے کر سکتے ہیں؟

آپ غزل کا مقطع ہے: سب میں تو ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

شاید یہ بات صحیح ہو کہ مجھ کو لکھنا تھی، تم جیسے سب کے عزیز یقیناً یاد آتے ہوں گے
لیکن ہوا یہ ہے کہ ہم یہاں ایسے کھو گئے جس کا علیحدہ ہوا کہ یہاں کی حرارت کے
ٹھنڈا ہو گیا۔ ویسے وہاں کے موجودہ غیر حاضری کا عذر تو ہے کہ جب لاہور سے
چلے تھے تو قطعی یہی خیال تھا کہ واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے (وہ تو خیر اب بھی ہے)
جو سب سوچتے تھے تو تمام سمت کو دیا ہے اب کچھ دن ہوئے سیدہ ثانی شاہ نے
ہمیں یہ بھیجی ہے، انھوں نے بتایا کہ آرام کے لیے جانا پڑا تھا تو وہاں سے کچھ انتظام
ضروری سمجھنے ہیں تو شاید بھیجا ہے کچھ دن لندن میں رہ کر تو دل ٹھکانے پر آ گیا
بھی لکھنا جواب یا کسی ملاقات کی دعوت ہو بیروت آ جاؤ تو ہم یہاں سے سلیموں سے

سے مشق ہوتی رہی لیکن ایک بار مستزاد جو پردہ صاحب سے اپنی وجہ پر الہن کا اوار شروع ہوا
کہ اب کلام پر تو ہو رہا ہے ہمیں جو بات ہے ۔ لیکن یہ سلسلہ اکتوبر ختم ہونے میں پیدا ہوا ۔ ہمیں
معلوم ہے کہ تمام تر تبلیغ کے لیے خاص شاگردوں سے کام لیتے ہیں ، ورنہ لیکن [illegible] ہوتا ہے
تم لیتے ہو کہ ادب و ثقافت کے دور بار میں اب بھی ہو رہے ہیں تو کیا قلم باقی ہے ([illegible]
سے چھپی کیا تو اب بڑی [illegible]) [illegible] کی فکر لیکن میں [illegible]
[illegible] ہوئے بھی بہت کچھ لیے [illegible] نہ ہونے کا [illegible]
پیش منیر [illegible] نہیں [illegible] ان کو [illegible] ذکر [illegible]
آپ نے دین اسلام کی بات کی ہے [illegible] آپ کی گواہی ہے یہ معجزات ہیں حلقۂ اسلام
میں داخل کی اشارت [illegible] یہ ترجمہ [illegible] علاوہ [illegible] جو بار [illegible]
یہ معجزات قرار [illegible] مسعود [illegible] اور تاثیر سے [illegible]
اسی وقت [illegible] بزرگوں [illegible] دین [illegible] اسلام
مولوی [illegible] [illegible] شمس العلماء [illegible]
ادب [illegible] [illegible] مولوی [illegible] [illegible]
قرات شروع [illegible] اسلام [illegible]
[illegible] [illegible] بہت [illegible]
[illegible] واقف [illegible]
اب شہر [illegible] دہلی ہے
اور [illegible] بات [illegible] آپ [illegible] عبد السلام [illegible]
قرار [illegible] [illegible]
[illegible] گفتگو [illegible] [illegible]

Faiz Ahmed Faiz

POST OFFICE BOX NO. 135/4
BEIRUT
LEBANON

ہم کے ساتھ "راولپنڈی سازش کیس کے اسیران" کا قومی جلسہ تھا، اب
ہمارے ایک عزیز دوست اور ایک کیس میں ہمارے ساتھی اسیر زنداں ... اور محمد ارباب
آپ کے دور رفاقت ہوئے ہیں ... ان کا نام کے ساتھ بھی ... ہے، لیکن
ضمیر جعفری اور ان باتوں کو ہم تو اب زندگی گزار چکے، صرف آخری سانس کا انتظار ہے،
... کچھ لوگوں کے ساتھ ... کسی بات کو ... طرح کی
... بات کو ... ان کا بھی ...
اور درد و کشش پیدا کیا ہے۔

یہاں دو تین دن پہلے ... کا سامنا ...
... سے ... ہم ...
... دن ...
... ایمبولینس کا ...
... ہو گیا۔
... والد والدہ دونوں ... ہمارے ...
... شہید ہو گئے ... شدید ...
... نہیں ہے۔

ان حالات میں ... البتہ ... کر رہے
کہ ... ہم بھی چلے آئیں

کچھ دن لگے انتظار کر لو لیکن دو چار شعر بھی سن لو

ہر بار ہمیں اب سطوتِ شاہی کی علامت
ہر بار کا لمحہ ہے کہ حقیقت کا علم ہے
آوارہ ہے ہر کوہ و بیاباں ہوش ربا
تمہید حسرت ہے کہ طولِ شبِ غم ہے
حسن وحشی کو گلیوں میں بکھرتے ہوئے لمحات
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علم ہے
حسن ملبوس ہے شعر کی دیوار درختاں
یہ موجِ تبسم ہے کہ دریا ہے حرم ہے
بیٹھے رہو حلقہ کیے اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

جالب
حبیب

فیض بنام افتخار عارف

بیروت

۲۶ مئی

عزیزی افتخار عارف

آپ نے عسکری مرحوم کی کتاب کے بارے میں رائے طلب کی ہے دینی اور فلسفیانہ مسائل کے بارے میں ہم جیسے کم علم لوگوں کو حرف زنی کا حق نہیں پہنچتا اس لیے ہمارا لکھنا تنقید نہیں محض تاثرات ہیں پہلا تاثر تو یہی ہے کہ اگر آپ کسی بھی مسئلے کے بارے میں پہلے ہی سے اپنے منتخب کردہ نظریے کو بغیر کسی وضاحت، ثبوت یا استدلال کے مسدقہ قرار دے لیں اور اس کے بعد اس نظریے سے اختلاف یا انحراف کو گمراہی تصور کریں تو آپ سے بحث لاحاصل ہے کوئی دوسرا فریق اسی طرح کسی مخالف نظریے کو اسی تحکمانہ انداز میں حرفِ آخر قرار دے کر آپ کی بہ بات کا توڑ کر سکتا ہے مزید برآں اگر آپ نے منطقی یا عقلی استدلال کو حدودِ عقل قرار دے کر پہلے ہی سے غیر معتبر ٹھہرا لیا تو بات آگے کیسے چلے چنانچہ اگر آپ تصوف، احدیت یا روحانیت (جس کی کوئی تعریف بھی آپ نے نہیں فرمائی) کو صداقت فرض کر لیتے ہیں اور پھر اس کی رُو سے مغرب کی گمراہیاں گنوانا شروع کرتے ہیں تو اسی طور کوئی مادیت کے نظریے کا قائل ایسی ہی فہرست مشرقی گمراہیوں کی تیار کر سکتا ہے ایمان یا عقیدہ تو لکم دینکم ولی دین کی ضمن میں آتا ہے اس کے بارے میں بحث کیسی؟ یہ تو ایک بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ نے ایک نیا کا مفروضے کو دلیل ٹھہرا لیا تو پھر آپ اسی کی بنا پر اور کئی مفروضات کو حقائق قرار دینے پر مصر ہوں گے جدیدیت ایسے ہی مفروضات سے بھری پڑی ہے مثلاً یورپ کا ذہن پچھلے چھ سو سال سے بتدریج مسخ ہوتا رہا ہے اور صداقت کو سمجھنے کی صلاحیت کھوتا رہا ہے اس کے خلاف علامہ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سو سال سے ہم مسلمانوں نے ذہن کے دروازے بند کر رکھے ہیں اور تفکر و تدبر کے احکامات الٰہی

سے روگردانی کر چکے ہیں اس لیے ہم میں صداقت کو سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی ہے عسکری صاحب کو مغربیوں سے بنیادی شکایت یہ ہے ان لوگوں نے ما آسمان پرواختن کے بجائے کار جہاں نکو ساختن، کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا ہے جو بہت بڑی گمراہی ہے لیکن یہ گمراہی تو شیخ سعدی سے لے کر چی شورد بامداد فرزندم 'یاراں فراموش کردند عشق وغیرہ) علامہ اقبال تک کئی مشرقی افکار میں بھی مل جائے گی پھر انسان دوستی، انفرادیت پرستی، اعمال و اخلاق کی اہمیت ان سب کو بھی آپ اہل مغرب کی بدعتیں قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں SECRETS OF EAST کے دیباچے پر ایک نظر ڈال لیجئے ہمارا کچھ کہنا سند نہیں ہے

یا مثلاً ایک سو انیسویں گمراہی یہ ہے نیت اور تصوف کے سلسلوں کو دین سے خارج قرار دینا تو کیا ہم نے وہابیت بھی مغرب سے درآمد کی تھی روایت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ معتزلہ وغیرہ کو روایت سے مسلک نہیں کیا جا سکتا تو بعض بزرگوں کی نظر میں فقہ جعفریہ حتیٰ کہ تصوف کے بعض مسالک بھی بدعتیں ہیں انھیں کیا کہئے گا۔ اسی طرح موجودات اور ماسوا دونوں کو حقیقی کہنا یہ بھی گمراہی ہے لیکن قرآن حکیم میں بھی ایک جانب یہ فرمایا گیا ہے کہ " حیوٰۃ الدنیا الا لھو ولعب " تو دوسری جانب یہ بھی ہے۔ خلقنا ھذا الدنیا بالحق، اگر یہ دنیا باطل نہیں تو حقیقی ہوگی۔

آخر میں مغربی فلسفہ اور سائنس کی بہت عمدہ تلخیص کے بعد (جو میری رائے میں اس کتاب کا قابل قدر حصہ ہے) ان سب کو گمراہی کی مختلف صورتیں قرار دیا گیا ہے چلیے تسلیم، لیکن ہمارے کرم دوست ڈاکٹر اجمل تو اس کتاب کو کورس میں شامل کر دینا چاہتے ہیں اس کورس میں ان مغربی خرافات، یہ تضییع اوقات کی کیا ضرورت ہے بہتر یہی ہے کہ اس کے بجائے حضرت بلھے شاہ کے ارشاد پر عمل کیا جائے یعنی۔

علموں بس کریں او یار
اکو الف تینوں درکار

بچارے ہمارے علماء کو جنھیں معقولات میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پر بھی پورا عبور نہیں ہے آپ روسو اور کانٹ، فرائڈ اور سارتر کے چکر میں کیوں ڈالنا چاہتے ہیں تفصیلی مطالعے کے لیے محض آپ کے چند جملوں پہ تکیہ کر کے یہ حضرات کسی بحث پہ کیسے پورا اتریں گے۔

شعروادب کے معاملات میں عسکری مرحوم کی بصیرت کا میں ہمیشہ سے معترف ہوں اگرچہ جدیدیت کی ادبی گمراہیوں پر متوجہ ہوتے تو غالباً بہتوں کا بھلا ہوگا۔ یہ تصنیف تو انہی حضرات کے کام آسکتی ہے جو پہلے ہی سے علم مغربی سے فیض یاب ہیں اور پھر دینی مسائل کی تفسیر و تشریح پر تو بقول عسکری صاحب کے علماء کا اجارہ ہے کالانعام کے لیے یہی بہتر ہے کہ "ملیا جپ کر دھڑ وٹ جا" (آپ سے اتنی پنجابی تو سیکھ لی ہوگی)، اگرچہ ہم عوام کے لیے پھر یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے بہتروں میں سے کس فرقے کے علماء کو معتبر جانیں اور یہ بھی ہے کہ ابن عبدہ، طٰہٰ حسین، جمال الدین افغانی، علامہ اقبال وغیرہ مع عسکری صاحب کے علماء میں شمار کیے جائیں کہ نہیں۔

لیکن یہ سب خردی عقل کی باتیں ہیں جو کہ خود گمراہ کن ہے البتہ ان سب باتوں سے قطع نظر عسکری مرحوم کی تحریر ART FOR ARTS SAKF کے لحاظ سے قابل تحسین ہے۔

مخلص

فیض

فیض بنام — میزو

لندن

پیاری میزو

تمہارے دونوں خط مل گئے تھے، ایک تاشقند میں ایک یہاں، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اور بچے سب خیریت سے ہیں ظاہر ہے کہ سب کو دیکھنے کے لئے دل ترستا رہتا ہے لیکن امید ہے کہ اور چند مہینوں میں ملنے کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ ابھی آئندہ کا پروگرام بالکل طے تو نہیں ہے لیکن غالباً گرمی کا موسم تو یورپ ہی میں کہیں گزرے گا۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے تمہیں اطلاع کر دیں گے اور تم لوگ یہاں یا جہاں کہیں بھی آؤ ہم آ کر مل لیں گے۔ کل یہاں اتفاق سے آغا ناصر سے ملاقات ہو گئی تھی جس سے لطف رہا، پیرس میں تمہارے افسر اعلیٰ یعنی جنرل صاحب سے بھی اپنے سفیر اخوند صاحب کے گھر ملاقات ہو گئی اور وہ کافی اخلاق سے ملے، وہاں پر تمہاری ایک اور سہیلی بھی تھی جو پیرس میں کچھ جرنلزم وغیرہ کرتی ہیں اور شاید اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں، نام یاد نہیں رہا، ایڈنبرا میں مس نگہت سے ٹیلیفون پر بات ہوئی تھی، تمہیں بہت پیار بھیجا ہے، یہاں آج کل ہم انکل افضل کے بجائے زہرہ نگاہ کے پاس ہیں، وہ بھی پیار ہے۔ سبھوں کو پیرس سے کارڈ بھیجے تھے جو امید ہے مل گئے ہوں گے

اگرچہ میرا اور عدیل کا خط پورا نہیں ہوا تھا کہ سفیر صاحب کی گاڑی آگئی، تمہارا
THESIS غالباً اب تک ختم ہو چکا ہوگا، نتیجہ کب نکلے گا۔
سب کو بہت سا پیار خاص طور سے دادی کو

ابوّ

پیاری میزو !

تمہارا بہت اچھا خط ملا، امید ہے چلنے سے پہلے تمہیں یہ خط مل جائے گا بہت شدّت سے انتظار ہے، باقی باتیں آنے پر ہوں گی، سب کو بہت سا پیار کچھ تُک بندی بھیجتا ہوں لیکن یہ چھپنے کے لئے نہیں ہے اس لئے کہ راولپنڈی میں نیرنگ خیال، رسالے کو اُن کے جوبلی نمبر کے لئے بھجوائی ہے۔

ابّو

مئی جون ۸۰ء

لندن

پیاری میرا رانی :

اب تو آپ بڑی ہو گئی ہیں اس لئے اب آپ کو الگ خط لکھا کریں گے، تھوڑے دنوں میں آپ خود بھی پڑھ سکیں گی۔ دادی آپ کو یاد کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ آپ ماما کے ساتھ بھی خوش ہوں گی۔

بہت پیار

نانا

۷ جنوری ۸۰ء

پیاری سبزو

تمہارا خط بھی مل گیا ہے، خوشی ہوئی، ٹھیک ہے تم، گرمیوں میں لندن کا طے کر لو ہم تو راستے ہی میں ہیں اور فی الحال ہمارے گھر لوٹنے کی صورت نظر نہیں آتی تمہاری امی شاید آسکیں لیکن اگر اور بچے لوگ آسکیں تو پھر کیا ضرورت ہے۔

یہاں کا موسم بہت عجب ہے، ایک دن دھوپ نکلتی اور گرمی ہو جاتی ہے دوسرے دن طوفان آتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرنے لگتے ہیں، پھر بھی ہم لوگ آرام سے ہیں اور کچھ پاکستانی اچھے لوگ بھی مل گئے ہیں، جن کے ہاتھ یہ خط اور چیزیں بھجوا رہے ہیں۔

بہت سا پیار

ابو

یہاں پر UBL کا TELEX بھی ہے اگر کوئی ضروری پیغام ہو تو TELEX کے ذریعے بھجوا سکتے ہیں۔

۱۱ جنوری

پیاری میزد

گذشتہ ہفتے خدا خدا کر کے سان فرانسسکو میں آپ کا تار اور پھر تمہارا خط ملا، میں تو ہر جگہ سے قریب قریب ہر ہفتے تمہاری امی کو باقاعدہ لکھتا رہا ہوں ایک آدھ خط اور کارڈ تم لوگوں کو اور بچوں کو بھی بھیجا تھا، بہت سے شعر بھی بھیجے تھے، نہ جانے یہ سب کچھ تم تک کیوں نہیں پہنچا، اب تک کچھ تو مل جانا چاہیئے تھا۔ دیکھیئے یہ بھی پہنچتا ہے کہ نہیں ورنہ کچھ انتظار کے بعد پھر تار بھجواؤں گا۔ امریکہ سب دیکھ تو لیا ہے لیکن دل ہر وقت آپ لوگوں میں لگا رہتا ہے اس لیئے کسی جگہ کچھ خاص لطف نہیں آتا۔ اس لیئے حمیرا سے کہہ دو کہ ہم کچھ عیش نہیں کر رہے ہیں اچھے دن آئیں گے تو مل کر عیش کریں گے، صرف قیوم لودھی اور اس کے خاندان کے ساتھ ' LOSANGELES میں کچھ دن اچھے گذرے یہاں اس کا بھائی اور بھاوج رہتے ہیں جو دونوں ڈاکٹر ہیں اور بہت خوشحال ہیں، ان لوگوں نے بہت تواضع کی۔ بہت سیر کروائی حتیٰ کہ پیش از وقت ہماری سالگرہ بھی منا ڈالی اور بہت سے تحفے بھی دیئے، سان فرانسسکو میں ہماری ایک دوست نے بھی کافی خیال رکھا، دیکھنے میں تو یہ جگہ بہت خوبصورت ہے لیکن ہمیں بالکل اسٹوڈنٹس کی طرح شہر سے دور ایک ہوسٹل میں ٹھہرا رکھا ہے جو کافی بور جگہ ہے، بلکہ میرا ہوسٹل تو زیادہ تر لڑکیوں کے لئے ہے، عدیل کی فرمائش تو پوری ہو جائے گی۔ تمہاری فرمائش کا کہہ نہیں سکتے اس لئے کہ یہاں سے واپسی اپنے پیسوں

سے ہوگی (ورنہ ماسکو واپس جانا پڑے گا) خیر کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ امی کچھ دنوں کے لئے چھٹی کر رہی ہیں۔ اور دادی بھی آگئی ہیں۔ ہمیں تو ان لوگوں نے بالکل جکڑ رکھا ہے اور اگلے مہینے سے پیشتر واپسی کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ لیکن جہاں اتنے دن گذرے ہیں یہ بھی گزر جائیں گے، جی بہت چاہتا تھا کہ سردی کا موسم گھر پر گذاریں لیکن خیر شائد وہاں پہنچ کر بھی دل دکھتا، اگرچہ حالات بدلتے رہتے ہیں اس لئے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ خط امی کو بھی سنا دینا، الگ سے بھی لکھوں گا۔

بہت سا پیار

الوؔ

پیاری میزو !

پرسوں یہاں پہنچ کر تمہارا خط ملا، بہت خوشی ہوئی۔ ہم اس بار گھر سے واقعی ایسی افراتفری میں نکلے کہ آپ لوگوں کو ٹھیک سے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکے لیکن حالات ہی ایسے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کے لئے اپنا دل بھی ایسا ہی بیتاب ہے لیکن اب تو کچھ دن صبر ہی کرنا پڑے گا، بہر حال تشویش کی کوئی بات نہیں، جلد یا دیر سے ملاقات ہو ہی جائے گی، تم لوگ پریشان نہ ہو۔ ابھی اپنا پروگرام بالکل طے تو نہیں ہے لیکن غالباً دو تین ہفتے کے بعد کینیڈا جانا ہوگا جہاں کی دعوت دیر سے رکھی ہے۔ پھر ہندوستان کا دورہ جو ملتوی کر دیا تھا۔ اسے پورا کرنے کا ارادہ ہے، اس کے بعد اکتوبر کے شروع میں تاشقند ایک ادیبوں کی میٹنگ ہے اور اس کے بعد جو خدا کو منظور ہوگا۔ تمہیں اطلاع دیتے رہیں گے۔ اگر تمہارے پروگرام کے لئے کچھ لکھنے وکھنے کی ضرورت ہو تو تفصیل بتا دو، آج کل ہمیں بہت فرصت ہے۔ شعیب، حمید اور بچوں کو بہت سے پیار، بچوں کو ہم خود بھی لکھیں گے اور غالباً کل پرسوں دادی سے ملاقات ہوگی۔

پیار کے ساتھ

ابو

۱۴ اگست

پیاری میزو جانم۔ عید مبارک

تمہارا خط ملا۔ پرانی کہانیوں کی طرح پڑھ کر ہنسی بھی آئی رونا بھی آیا اگرچہ اب ہنسی بھی کم آتی ہے اور رونا بھی۔

ماما اور یاسر کے آنے سے اگلے دن ہم صوفیہ (بلغاریہ) چلے گئے تھے۔ جہاں بچوں کا بین الاقوامی میلہ ہو رہا تھا اور وہاں سے کل واپس آئے ہیں وہاں ہماری دلچسپی کا تو کوئی خاص سامان نہیں تھا البتہ یاسر کی کافی سیر ہو گئی، اب دو چار دن کے بعد ہم کسی سینی ٹوریم میں جا رہے ہیں اور وہاں سے واپسی پر ماما اور یاسر گھر چلے جائیں گے اور ہم کوئی اپنا ٹھکانہ پیدا کریں گے۔ آج کل بیروت زیر غور ہے لیکن ابھی بالکل طے نہیں ہوا اس لئے کہ تاشقند بھی امیدوار ہے جب سر چھپانے کی صورت ہو جائے گی۔ تو ماما کو بلا لیں گے، بیروت میں یاسر عرفات بہت تپاک سے ملے، شاید وہاں کا احوال جنگ میں چھپے گا۔

تمہاری گڑبڑ کا ماما نے بتایا تھا لیکن اس سے زیادہ دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں بھی تو ڈپٹی سیکرٹری ہی کی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن اس سے ہماری شان میں کیا فرق آ گیا ہم اب بھی امیروں وزیروں کو پاؤں کی دھول سمجھتے ہیں، اصل تسلی کی بات تو اپنے علم و ہنر کی ہے، اس کی قیمت جاہلوں سے وصول ہو یا نہ ہو، اور علی کی شکایت سر آنکھوں پر، ہم نے اسے اس لئے نہیں بلایا کہ سننے میں یہی آیا تھا کہ اسے اپنی پڑھائی کے ہرج کی زیادہ فکر رہتی ہے

ورنہ ہم کو تو سب بچے ایک جیسے پیارے ہیں اور علی کا تو پہلا نمبر ہے اس لئے کہ
سب سے پہلے وہی وارد ہوئے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں اب کرسمس یا اپریل کی
چھٹیوں میں اسے کسی زیادہ دلچسپ جگہ کی سیر کروا دیں گے تمہارا Hawaii کا
ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ امریکہ کی ایک آدھ اور یونیورسٹی میں بھی کوشش کی جا سکتی
ہے، یہاں کی مشکل یہ ہے کہ ایک سال تو زبان سیکھنے میں لگ جاے اور یہاں کا
تعلیمی نظام اتنا مختلف ہے کہ وہاں اس کی کوئی application نہیں ہو سکتی
پہلے HAWAI کا نتیجہ دیکھ لیں پھر کچھ اور سوچیں گے، اگر جب تک کا معاملہ
طے ہو جائے تو سب سے اچھی جگہ آگے پڑھنے کے لئے وہی ہے۔ کا امریکہ سے
خط آیا ہے اور سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو ٹھیک سے
اندازہ نہیں ہے کہ آج کل ان ملکوں میں پاکستا ۔ ں کی مانگ بہت کم ہے البتہ
کوئی ڈاکٹر، انجینیر وغیرہ ہو تو دوسر ۔ بات ہے اور ہمارے لئے زیادہ اداس
ہونے کی ضرورت نہیں، انشاءاللہ ان سردیوں میں یا ہم گھر کا چکر کریں گے یا تمہیں
اور علی کو کہیں بلالیں گے، جب پیسوں کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ تم
نے یہاں کسی کا استعفا بھیجا ہے؟ آج کل تو سب لوگ چھٹی پر ہیں بہرحال
جو تمہیں چاہیئے لکھ دو ہم خود انتظام کر لیں گے، حمید نے بھی کسی کے ہاتھ بھیجے ہیں کہ
تھا وہ بھی اب تک نہیں ملے۔

باقی پھر

شعیب حمید دادی اور بچوں کو بہت سا پیار

ابو

ص ب ۱۳۵۴۳۰

بیروت، لبنان

پیاری منیزہ!

تمہارا خط ملا، گذشتہ بار PITSUNDA میں تمہارا خط ملا تھا تو بہت دل اداس ہوا اب کے بہت خوشی ہوئی، کچھ اس وجہ سے بھی کہ اب ہم بالکل بے گھر نہیں ہیں دور ہی سہی لیکن ٹھکانہ تو ہے اور پھر اب تمہاری امی بھی ساتھ ہیں۔ اس لئے پہلی سی تنہائی بھی نہیں ہے، ضمیر کا قصہ سن لیا تھا۔ "یوں ہی ہمیشہ مرے یار ہوتی آئی ہے" اس لئے افسردگی یا دل شکنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اپنے حقوق کے لئے لڑنا ضرور چاہیئے۔ امید ہے اب تک معاملہ سلجھ گیا ہوگا۔ سلجھ جائے گا۔ ورنہ "روزی تو کسی طور کما کھائے مچھندر"

تمہارا Hawaii کا وظیفہ ہو جائے تو بہت اچھا ہے، بہت خوشگوار جگہ ہے اور ملنے والے بھی بہت ہیں۔ اس لئے تمہارا دل لگا رہے گا اور جو تم نے پندرہ دسمبر سے اگلے ماہ تک چھٹی کا لکھا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ یہاں آنے جانے میں کتنے پیسے لگتے ہیں، اگر بہت زیادہ نہ ہوں تو فنڈ سے [illegible] کر لیں گے، البتہ علی صاحب کو ساتھ لانا ہوگا اگرچہ یہاں بدامنی کی وجہ سے بچوں کی دلچسپی کا کوئی خاص سامان نہیں پھر بھی ہمارا فلیٹ سمندر کے کنارے اچھی جگہ پہ ہے اور اس علاقے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے، امریکہ سے خط آیا تھا لیکن وہاں اب سر چھپانے کی جگہ مشکل ہی سے ملتی ہے اس لئے

غالباً اب تک گھر واپس پہنچ چکے ہوں گے تمہاری امی کو یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے ہیں۔ لیکن ہمیں کافی دیر غور کرنا پڑا کہ ہم دونوں ایک دن پہلے آئے تھے یا دو دن پہلے، کچھ ایسے لگتا تھا کہ کئی دنوں سے یہاں ہیں، آپ لوگوں کی یاد کے علاوہ باقی ہر طرح سے آرام ہے اور امید ہے کہ جدائی کا زمانہ بھی جلد گزر جائے گا۔

بہت سا پیار

ابو

---

۱ سوویت یونین کی جمہوریہ جارجیا کا ایک شہر جہاں عالمی ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔

۵ مارچ

پیاری منیرہ،

بہت دنوں سے تمہارا کوئی خط نہیں آیا اور مجھے افسوس ہے کہ مصروفیت کے باعث ہم بھی نہیں لکھ سکے لیکن چھیمی کے خطوں سے آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہی۔

یہاں پر دو تین ہفتے بہت کڑاکے کی سردی پڑی اور بارش بھی مسلسل ہوتی رہی۔ جو لوگ کہتے ہیں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، اب موسم کھل گیا ہے اور لاہور کے گلابی جاڑوں کی یاد آتی ہے اپنا پروگرام یہ رہتا ہے کہ صبح آٹھ نو بجے ناشتہ کرتے ہیں پھر گھر کے کمرے سے اٹھ کر سامنے والے دفتر کے کمرے میں جا بیٹھتے ہیں، دو تین بجے کھانا کھا کر ایک آدھ گھنٹہ سوئے دن میں تمہاری امی دو تین گھنٹے شہر کے گلی کوچوں کا چکر لگاتی ہیں ہم زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ ہوا کھاتے ہیں اور بہت ہمت کی تو کسی دن امی کے ساتھ فلم دیکھ آئے ہیں۔ شام کو عام طور سے نہایت گھٹیا T.V دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی بور پارٹی میں جانا ہوتا ہے باقی وقت کچھ پڑھتے ہیں اور تم لوگوں کو یاد کرتے ہیں، یا گولیاں چلنے کی آواز سنتے ہیں، لیکن یہ آوازیں دور سے آتی ہیں ہمارے محلے میں بالکل امن ہے اس لئے کہ یہاں کوئی لیڈر نہیں رہتا۔ ویسے یہاں آرام بہت ہے اور کسی چیز کی تکلیف نہیں۔

چھیمی نے لکھا ہے کہ وہ [illegible] میں آئیں گے، آپ لوگوں کا کیا پروگرام طے ہوا ہم سب کو اور خاص طور سے [illegible] دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ تاکہ ہم اس کے ساتھ [illegible]

شاید نہیں پہلے لکھا یا نہیں لکھا کہ انگلستان میں ہمارے ایک عزیز اور قابلِ اعتبار دوست بدر جو برمنگھم میں رہتے ہیں فریدہ خانم کو وہاں بلوانا چاہتے ہیں۔ ٹکٹ اور رہنے سہنے کے انتظامات کے علاوہ ان کی تجویز یہ ہے کہ پبلک CONCERTS کی آمدنی آدھی آدھی تقسیم کرلیں یا کوئی (MINIMUM) رقم وہ تجویز کردیں، جیسا کہ میں نے لکھا ہے، شریف اور اعتباری لوگ ہیں اور ان کا پیشہ ور تماشہ گروں سے واسطہ نہیں۔ تم کسی دن اس کو ہمارا پیار اور یہ پیغام پہنچا دو، اگر وہ چاہیں تو میں الگ سے بھی لکھ دوں گا۔ ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ مناسب ہوگا۔ وہ اپنی شرائط تفصیل سے مجھے لکھ بھیجیں تاکہ میں لوگوں کو مطلع کروں۔ سنا ہے کہ فنکاروں کو باہر جانے کی اجازت اب مشکل سے ملتی ہے شاید اس سلسلے میں کچھ امداد کرسکیں۔ ہمیں اب جنگ، اخبار باقاعدگی سے ملتا ہے۔ لیکن اب اس سے بوریت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنا کام چل رہا ہے اور آج کل نئے شعر کی تیاری کی وجہ سے کافی مصروفیت ہے۔ تم لوگوں کے لئے امی نے کچھ چیزیں خرید کر رکھی ہیں لیکن بھجوانے کی کوئی صورت موجود نہیں بہتر یہی ہے کہ تم خود ہی آکر وصول کرلو۔

بہت سا پیار
ابو

بیروت ۔ لبنان
اپریل ۸۰ء

پیارے میزو!

بہت دنوں کے بعد تمہارا لمبا خط ملا، دوسرے حالات پر تو اپنا اختیار نہیں البتہ اپنی صحت کے بارے میں احتیاط ضروری ہے، اگر ڈاکٹر کہتے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ کچھ دن چھٹی لے کر آرام کرو۔ اگرچہ تمہارے چڑیا گھر میں بھی کچھ آسان بات نہیں اگر اپنے کام سے دل بہت تنگ آگیا ہے تو اس سے بھی چھٹی کرو، اب تمہارے پاس ڈگری تو موجود ہے، پڑھانے کے کاروبار میں پیسے کم ملیں گے لیکن کام بھی تو کم ہوگا گوشت نہ سہی، دال روٹی سہی، پیسے سے سکون بہتر ہے۔ اگر صبر ہو سکے تو وہ بھی ٹھیک ہے، حالات اگر بدتر ہو سکتے ہیں تو کبھی نہ کبھی بہتر بھی ہو سکتے ہیں" رات دن گردش میں ہیں سات آسمان" اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، اگر امریکہ والے کچھ شرافت کریں تو سب سے اچھا ہے۔

ہم دونوں آرام سے ہیں البتہ تم سب کو دیکھنے کے لئے دل بیقرار رہتا ہے امید ہے اس سال کسی نہ کسی صورت ملنا ہو ہی جائے گا۔ تمہارے دوستوں کے لئے ان کی فرمائش بھیج رہا ہوں۔

بہت سا پیار

ابوّ

بیروت ۔ لبنان
۱۱، اپریل

پیاری میزد!

تمہیں ایک خط لکھا ہی تھا کہ تمہارا دوسرا خط آ گیا، بہت خوشی ہوئی دفتری دردِ سر کا تو جیسے میں نے لکھا تھا کوئی علاج نہیں۔ جہاں تک ہو سکے ہمارا اسپوئچ آف کرنے والا نسخہ استعمال کرنا چاہیئے۔ اس سے بھی اچھا نسخہ مرحوم ملک فیروز خاں نون کا ہے لیکن شاید وہ صرف بڑے بڑے افسر استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ جب ہم دہلی میں تھے تو ملک صاحب وائسرائے کی کونسل کے ڈیفینس ممبر تھے ایک دن میں اور بڑے بخاری دفتر میں ان سے ملنے گئے دیکھا کہ ملک صاحب کی میز پر ایک بھی کاغذ نہیں اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے چرٹ پی رہے ہیں۔ بخاری صاحب نے کہا ملک صاحب لڑائی ہو رہی ہے اور آپ ڈیفینس ممبر ہیں آپ کو کام کوئی نہیں۔ ہے ملک صاحب بولے، شاہ جی کم دانہ پچھو، جتنا کرو اونہا ای ودھدا اے۔ اس لئے کروای نئیں۔ بچوں کے امتحانات سے خوشی ہوئی خود تمہارے اور اپنے گھر کے باغوں پر بہار آنے سے بھی، اگرچہ اس کے تصور سے دل اُداس بھی ہوتا ہے، لیکن اتنی تسکین کہ کبھی آ کر دیکھ بھی لیں گے،

اور یہ دہلی، بیروت کے ٹکٹ والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی، کیا آپ لوگ دہلی ملنے آئیں گے؟ اگر ایسا ہے تو ممکن ہو سکے تو تم اپنی چھٹی تین مئی کے بجائے یکم مئی سے شروع کروالو تو اچھا ہے اس لئے کہ شاید ہم یکم مئی کو خود ہی دہلی پہنچ جائیں۔ ابھی پروگرام بالکل طے تو نہیں ہوا لیکن اگلے ہفتے تک طے ہو جائیگا اور

یوں ہے کہ ہم ۱۶ مئی کو ماسکو جائیں گے۔ وہاں سے ۴ تاریخ کو کلکتہ اور غالباً پہلی مئی کو دہلی یہاں تین چار دن رکنا ہوگا۔ پھر شاید تین چار دن کے لئے کہیں اور جانا پڑے، اس کے بارے میں ماسکو سے تمہیں تار میں تفصیل لکھ دیں گے اگر ملاقات ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ ویزا میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے، ان کے سفیر صاحب ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس خط کا جواب یہاں تو نہیں پہنچ سکتا۔ دہلی میں مسز شیو سندھو کا پتہ جو چھیمی کو لکھا تھا اس پر بھجوا دینا اور اگر ان دنوں کوئی ہندوستان جا رہا ہو تو ہماری کچھ کتابیں بھی، تاریخ ادب اردو، (دو تین کتابیں ہوں گی) اور کلیاتِ اقبال (اگر مل جائے تو)

ماما نے پھر چلتے ہوئے کہیں گر کر پاؤں میں چوٹ لگالی تھی، اب ٹھیک ہیں۔ بہت دنوں سے کچھ لکھا نہیں تھا۔ کل فارسی رنگ میں کچھ تک بندی کی تھی جو لوگوں تک پہنچا دینا اور یہ احسان جتانے کی کیا بکواس ہے جیسے ہم تم کوئی الگ الگ چیز ہیں، ہمارا تمہارا احسان یہی ہے کہ پیار کرتے رہیں اور خدمت کرنے کی ضرورت تو شاید جب پڑے گی اور اگر دس بیس برس جینا پڑا اور ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، پھر تو ہم گاؤں چلے جائیں گے جہاں میراثی حقہ بھرا کرے گا اور میراثن پاؤں دبایا کرے گی۔

سب کو بہت سا پیار

ابوّ

بیروت، لبنان

۱۶ مئی

پیاری میترو!

تمہارا خط کلکتہ اور دہلی سے واپسی پر ملا، اس بار تو تم نے کافی اچھی خبریں سنائیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد ملاقات بھی ہو جائے گی۔ HAWAI تمہیں ضرور پسند آئے گا۔ اور وہاں پر کچھ اپنے ملنے والے کافی اچھے لوگ بھی ہیں، جب بچے آجائیں گے تو اور بھی رونق ہو جائے گی۔ دور تو بہت ہے لیکن شاید ہم بھی کسی بہانے سے چکر لگا سکیں۔ خیر وہ تو بعد کی بات ہے پہلے تم لوگ تو آؤ، امید ہے اب تک تمہارے سفر کی کارروائیاں پوری ہو چکی ہوں گی وہاں ہر کام میں الجھنیں تو ضرور پیدا ہوتی ہیں لیکن صبر اور ہمت سے معاملات سلجھ بھی جاتے ہیں؟ جیسے کا مقصد ہوا۔ میں براہ راست انہیں لکھنا نہیں چاہتا۔ شاید اس پر کسی کو اعتراض ہو۔ اس لئے میری طرف سے میاں بیوی کو پیار اور مبارکباد پہنچا دینا اور کہہ دینا کہ جو خزانہ ان کے ہاتھ آیا ہے اس میں ہماری پارٹی کے پیسے بچا رکھیں، آخر کبھی نہ کبھی تو ملاقات ہوگی۔

باقی باتیں تمہارے آنے پر ہوں گی۔

دادی کو سلام اور سب بچوں کو بہت سا پیار

ابو

بیروت - لبنان

پیاری چیم، تمہارا خط ملا۔ خوشی ہوئی۔

ایک پنجابی ترانہ اور ایک آدھ اور چھوٹی موٹی تک بندی بھیج رہا ہوں۔ ہندی گیت کینیڈا میں ایک ہندوستانی لڑکی کی فرمائش پر لکھا تھا، ایک شعری محفل میں اس نے کہا مشکل اُردو ہماری سمجھ میں نہیں آتی کچھ ہندی زبان میں سنایئے، میں نے پوچھا آپ کیا کرتی ہیں۔ کہنے لگیں باتیں کرتی ہوں،

بہت سا پیار — ابّو

پنجابی کسان کیلئے ترانہ

اٹھ اُتاں نوں جٹّا

مردا کیوں جانئیں،

بھولیا توں جگ دا ان داتا

تیری باندی دھرتی ماتا

توں سب دا پالن ہار

تے مرداں کیوں جائیں

اٹھ اُتاں نوں

جرنل کرنل، صوبیدار

ڈپٹی، ڈی سی، تھانیدار

سارے تیرا دتا کھاون

توں جے نہ بیجیں، توں جے نہ گاہیں
بھکتے بھانے سب مر جادن
ایہہ چاکر، توں سرکار
مردا کیوں جانیں
صدر کچہری، چوکی تھانے
کیہہ ان بھول تے کیہہ سیانے
کیہہ اشراف، تے کیہہ نمانے
سبھے کھجل خوار
مردا کیوں جانیں،
کرلئو اکا، ہو جیئو کٹھے
کیہہ رانگڑ کیہہ چیمے چٹھے
سبھے دا اک پریوار (یری وار خاندان)
مردا کیوں جانیں
اُٹھ اُتاں نوں

جے پڑھ آون فوجاں والے
توں وی چھویاں لمب کرالے (تیز کرالے)
دے اللہ ہو دی مار
تے مردا کیوں جانیں،
ابکے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول بنے، جو قید تھے اب صیاد ہوئے
پہلے بھی خزاں میں باغ اجڑے پر یوں نہیں جیسے ابکے برس

سارے بوٹے پتہ پتہ روش روش برباد ہوئے
اک گل کے مرجھانے سے کیا گلشن میں کہرام مچا
اک چہرہ کمھلا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے۔
پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا، تھی رسم محبت والوں کی،
ہم تم سے پہلے بھی یہاں، منصور ہوئے فرہاد ہوئے
فیض نہ ہم یوسف، نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

گیت

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں (چتا مردہ جلانے کی آگ)
آؤ کوئی بیت بنائیں
جن کی راہ تکتے جگ بیتے
چاہے وہ آئیں، نہیں آئیں
آنکھیں موند کے نت پل دیکھیں
آنکھوں میں ان کی پرچھائیں،
اپنے دردوں کا مکٹ پہن کر (مکٹ تاج)
بے دردوں کے سامنے جائیں
جب رونا آوے مسکائیں۔
جب دل ٹوٹے دیپ جلائیں،
پریت کی ریت انوکھی ساجن،
کچھ بھی نہ مانگیں سب کچھ پائیں،

پریم کتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دُہرائیں
فیضؔ ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں۔

ماسکو
۹ر جولائی

پیاری چھیمی اور میزد

آپ دونوں کے خط مل گئے تھے، جواب میں اس لئے دیر ہوئی کہ ہم پھر آوارہ گردی میں مصروف تھے اور اپنا کوئی ڈھب کا پتہ نہیں تھا۔ لندن سے یہاں پہنچ کر چند دن کے بعد تین ہفتے کے لئے انگولا جانا ہوا۔ جہاں سے پچھلے ہفتے واپسی ہوئی ہے اب دو چار دن کے لئے بیروت جانا ہے۔ ہمارے میگزین کا عربی ایڈیشن وہاں سے بھائی یاسر عرفات کے دفتر سے چھپا کرے گا۔ جس کے انتظامات کا پتہ کرنا ہے۔ وہاں سے لوٹ کر پھر کچھ دن یہیں کہیں گزریں گے۔ جب تک تمہاری امی بھی آجائیں گی اور شاید یاسر بھی پھر کچھ دن، کہیں چھٹی کریں گے اور اس کے بعد شاید کوئی ٹھکانہ طے ہو جائے۔ امی نے لکھا ہے کہ شاید آپ لوگ یورپ نہ آسکیں لیکن کوئی ایسی فکر کی بات نہیں اس لئے کہ گرما گزر جانے کے بعد ہم گھر کا چکر ضرور کریں گے۔ اس سلسلے میں آپ کے ذریعہ محمود ہارون سے یہاں تفصیلی بات ہو گئی تھی، میزد کی کامیابی کی بہت خوشی ہوئی۔ اس کا تحفہ اپنے ذمے ہے، امی کے ہاتھ پہنچا دیں گے، ایک غزل دوبارہ لکھی ہے اور ایک نظم سن لو

— نذرِ داغ

"لاؤ تو قتل نامہ مرا"

سُننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی"
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سُو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازیِ میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
"لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی"

فیض

۳۰ دسمبر ۷۹ء

پیاری چھیمی اور میزد

بہت سا پیار، آپ لوگ کس حال میں ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو یہاں جو کچھ بکواس ہم لکھتے رہے ہیں آپ تک پہنچ چکا ہوگا۔ تصویر قیوم لودھی کے بھائی کے گھر میں لی گئی۔ جو لاس اینجلز میں ہے، ہم کل قیوم کی دعوت پر یہاں آئے تھے۔ ہم کل قیوم کی دعوت پر یہاں آئے تھے۔ دو چار دن میں سان فرانسسکو واپسی ہوگی پھر دو تین ہفتے کے لئے Hawaii جانا ہوگا اور پھر گھر آجائیں گے۔ اگر تمہیں کچھ چاہیئے ہو تو اس پتہ پر جلدی سے لکھ بھیجو۔

لنـدن

پیارے یاسر !

آپ کیسے ہیں، آنٹی طاہرہ کے ہاتھ تمہارے لئے ایک کھیل بھیجا تھا، امید ہے مل گیا ہوگا۔ سنا ہے وہاں گرمی بہت ہے۔ لیکن اب تو تھوڑی بہت گرمی یہاں بھی ہے اور پرسوں ہم نے پہلی دفعہ ٹھنڈے کپڑے پہنے ہیں کل ٹی وی پر ٹسٹ میچ دیکھا تھا۔ لیکن ہماری ٹیم بہت جلد آؤٹ ہو گئی۔

بہت سا پیار

نانا

فیض بنام عبداللہ ملک

یکم اپریل

برادرم عبداللہ!

آپ کے دونوں خط اور احتساب کا دوسرا شمارہ مل گیا ہے۔ یارانِ باصفا نے جس انداز سے ہمیں یاد کیا اس کی تفصیل چھیمی کے خط سے موصول ہو گئی تھی، دل خوش بھی ہوا اور آہ اس بھی۔ صرف اتنی تسکین ہے کہ یار زندہ ہیں تو صحبت باقی ہے۔ دیکھئے کب کب نصیب ہو۔ برلن میں سعداللہ سے ملاقات رہی۔ لیکن مختصر غالباً ایک دو ماہ کے بعد پھر جانا ہو گا۔

کہانی مل گئی ہے، آئندہ کسی شمارہ میں کام آجائے گی

کل ہی دہلی اور ماسکو سے واپسی ہوئی ہے، دہلی میں دوستوں کے ساتھ کافی لطف رہا۔ کام بہت جمع ہو رہا ہے اس لئے حکایت طویل نہیں ہو سکتی، فرصت میں کبھی تفصیل سے لکھوں گا، جولائی کے مہینے کے لئے فی الحال کوئی پروگرام طے نہیں ہے البتہ اس ماہ کے آخر میں غالباً ہندوستان کا ایک اور دورہ ہو گا۔ یہاں پر یہی تو ایک سہولت ہے کہ اب اپنا اختیار ہے چاہیں جدھر چلیں۔ باقی آئندہ۔

مخلص

فیض

بیروت۔ لبنان
۱۳ جون

برادرم عبداللہ

بہت دنوں کے بعد تمہارا خط دیکھنے میں آیا خوشی ہوئی۔ دردِ فراق اور اشتیاق ملاقات یکساں ہے اور امید دید قائم، اس پیر کے دن بچوں کے آنے کی خبر ہے۔ کچھ دنوں کے لئے رونق ہو جائے گی۔ اور ان کی زبانی یارانِ وطن کے قصے سننے میں آئیں گے تو ہم تصور میں بزم چراغاں کر لیں گے۔ تمہاری ہمت اور محنت کی داد دیتے ہیں کہ اتنا کچھ لکھ لیتے ہو، یہاں تو خط لکھنے کے لئے بھی قلم رواں نہیں ہوتا۔ عجب تماشا ہے کہ یہاں فرصت بھی ہے اور ایک حد تک بےفکری بھی، لیکن بات کرنے کو اور سننے سنانے کو ایک دوسرے کے علاوہ کسی کی صحبت نصیب نہیں۔ جس کے نتیجے میں دل و دماغ کے کل پرزے زنگ آلود ہوتے جا رہے ہیں البتہ باہر جا کر ان کی تھوڑی بہت SERVICING ہو جاتی ہے جیسے ابھی ہندوستان جا کر ہوا۔ یا کبھی لیلائے سخن سے دل بہل جاتا ہے۔ لکھنے کے لئے کئی طرف سے کئی طرح کی فرمائشیں رکھی ہیں شاید کچھ عرصے کے بعد غربت کی ہوا راس آجائے تو ہم بھی تمہاری تقلید میں کسی کام میں لگیں۔ فی الحال تو موڈ نہیں ہے۔ غالباً سب کچھ بھی اپنی کاہلی کے لئے عذر گناہ ہے۔ لیکن اس گناہ سے ہمیں انکار کب تھا اور اس کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ تو پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ لوٹس میگزین ہی سہی یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم بھی محمل باندھ

رہے ہو۔ بیروت لیں، تو ہر جگہ کے لئے راستے میں پڑتا ہے صرف راستہ ذرا ٹیڑھا ہے اس
لئے کہ کوئی جہاز وہاں سے سیدھا یہاں نہیں آتا لیکن یہ کوئی ایسی بڑی ذلت بھی نہیں، اس
کے علاوہ پہلے سے پتہ چلے تو ہم بھی ادھر ادھر سیر مار سکتے ہیں۔ حمزہ علوی کی بیگم کے گزر
جانے کا رنج ہوا ہے، حمزہ کا پتہ لکھ بھیجو تاکہ ہم بھی تعزیت کر سکیں۔ ہمیں سالگرہ مت
یاد دلواؤ۔ سٹھیائے ہوئے ایک زمانہ ہوگیا ہے "ستّرہ، بہتّرہ" ہونے کی کسر باقی تھی۔ سو وہ
وقت بھی قریب آ پہنچا، اس کے بعد تو صرف کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے۔
تم کسی طرح ادھر آنکلو تو مزید باتیں کریں۔

مخلص

فیض

از بیروت
۲۰ر دسمبر

برادرم عبداللہ

آپ کے دونوں خط اور کتابیں ماسکو سے روانگی کے وقت ملیں، بیشتر کتابیں مرزا کے حوالے کر آیا ہوں تاکہ وہاں انکی تشہیر ہو سکے۔ اس شہر میں تو عربی انگریزی اور فرانسیسی کے علاوہ کسی بدیسی زبان سے نہ کسی کو واقفیت ہے نہ دلچسپی اس لئے یہاں لانے میں کوئی مصرف نظر نہیں آیا۔ البتہ احتساب کا دوسرا شمارہ اور اپنی دلچسپی کی ایک دو کتابیں میں ساتھ لے آیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد دو تین ہفتے دفتر کے ابتدائی انتظامات یعنی فرنیچر ٹائپ رائٹر کارکنوں کی تلاش وغیرہ میں گذرے، اب کچھ فراغت ہوئی ہے تو لکھنے بیٹھا ہوں۔

۱۔ کچھ منظومات آپ کے لئے چھیمی کو بھجوادی ہیں، ان سے لے لیجئے، خیال یہ تھا کہ یہاں بر ڈاک کا انتظام کچھ بہتر ہو گا اور خط و کتابت میں کچھ سہولت رہے گی، لیکن سارا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے، اپنے چند ہم وطن جو یہاں پر ہیں سفارت خانے کے ذرائع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں سفیر صاحب سے یاد اللہ ضرور ہے، لیکن انہیں زحمت دینے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے صبر کے علاوہ چارہ نہیں اگرچہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا نہیں ہوتا۔

۲۔ احتساب کا پہلا شمارہ صرف سرسری نظر سے دیکھ سکا۔ اس لئے کہ ایک ہی نسخہ مختلف ہاتھوں میں گردش کر رہا تھا، دوسرا شمارہ مطالعہ کر رہا ہوں، پہلا تاثر یہ ہے کہ بقول جوش ذرا آہستہ لے چل ... وغیرہ وغیرہ، خاص طور سے منظومات میں کچھ چیزیں غیر محتاط محسوس ہوئیں لیکن آپ اپنی بھلا برا مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

۳۔ غالباً مرزا نے آپ کو بتایا ہو گا کہ کاروباری معاملات کی ابتدا آپ ہی کے ہاں سے ہونی چاہیئے۔ مرحوم کا دردناک سانحہ نہ ہوا ہوتا تو ہم مل کر کچھ کر سکتے تھے۔ کیونکہ ہماری دکالت

صلاحیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ چرب زبانی کا جو ملکہ تمہیں حاصل ہے ہم اس سے بالکل محروم ہیں، بہرحال اپنی سی کوشش کریں گے۔

۴۔ LOTUS کا حالیہ شمارہ پریس میں جا چکا ہے، اس میں بیشتر انگولہ کانفرنس سے متعلق دستاویزیں وغیرہ ہیں جو شاید زیادہ آپ کے کام کی نہ ہوں اس پر طرفہ یہ ہے کہ اس کا جو انگریزی مسودہ ہم عربی ایڈیشن کے لئے ساتھ لائے تھے مترجم صاحب نے گم کر دیا ہے، اب اس کی نقل کا انتظار ہے۔ آئندہ شمارے کا مواد آپ کو بھجوا دوں گا اور اسی میں ریویو بھی ہو جائے گا۔

نثر لکھنے کے لئے فی الحال دماغ حاضر نہیں ہے لیکن انگریزی زبان میں کچھ غیر مطبوعہ (یعنی اردو غیر مطبوعہ) مقالے اپنے پاس ہیں، کہیں تو بھجوا دوں، آپ ترجمہ کروا لیجئے، ظاہر ہے کہ اپنے جریدے LOTUS کے معاملات SET کرنے میں کچھ وقت لگے گا، یہ کام پوری طرح چالو ہو جائے تو زیادہ طمانیت سے بات ہو سکے گی۔

مخلص

فیض

ہم اور آپ

۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو روزنامہ "امروز" کا اجراء عمل میں آیا تھا اس وقت "پاکستان ٹائمز" ایک سال سے نکل رہا تھا۔ فیض احمد فیض پاکستان ٹائمز کے ساتھ "امروز" کے بھی چیف ایڈیٹر مقرر ہوتے تھے۔ اور بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ "امروز" کا پہلا اداریہ فیض احمد فیض نے ہی رقم کیا تھا۔

چنانچہ اس اداریے کو پیش کر رہا ہوں۔ اس سے فیض اور جس ادارے سے وہ متعلق تھا یعنی میاں افتخار الدین اور ان کے ہم فکر دوستوں کے افکار اور نظریات کا علم ہو جاتا ہے کیونکہ آج ان نظریات اور افکار کو مخالفوں نے جھوٹ اور مبالغوں کی دبیز تہوں میں دبا دیا ہے کہ اصل فکر تک پہنچنا محال ہوتا جا رہا ہے اور تاریخ مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اب وہ وقت آ رہا ہے کہ تاریخ پر سے جھوٹ اور افتراء کے پردے چاک ہوں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اب شروع ہو چکا ہے۔

یہی نہیں کہ بس اپنا حساب دینا ہے
مرے دکھوں کا بھی تجھ کو جواب دینا ہے

پاکستان میں اور آسائشوں کی کمی ہو تو ہو اردو اخبارات کی کمی نہیں شاید ہی کوئی سیاسی عقیدہ یا سماجی مسلک ایسا ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی ترجمان پاکستان کے کسی نہ کسی گوشہ میں موجود نہ ہو ہم نے ان اخبارات کی تعداد میں اضافہ کرنا کیوں ضروری سمجھا، وہ کون سے مسائل یا مباحث ایسے ہیں جو ابھی تک ہماری نظر میں مزید تشریح

تعبیر کے محتاج ہیں ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ کوئی ایسا اچھوتا مسئلہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے جو باتیں ہمارے دل میں ہیں وہی ہر ایک کے دل میں ہیں اور جو مسائل ہمارے سامنے ہیں وہی سب کے سامنے ہیں اگر کوئی بات ہے تو صرف اتنی کہ ہماری قوم اور ہمارے دیس کے لیے ان مسائل کی اہمیت اس نوع کی ہے کہ ان پر بحث اور ذکر، فکر اور محاسبہ کی نہ صرف بہت کچھ گنجائش باقی ہے بلکہ ہمیشہ باقی رہے گی۔

ہم آزاد پاکستان کے آزاد شہری ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، ہم ایشیائی ہیں، ہم انسان ہیں۔ پچھلے ایک سال میں پاکستان کے رہنے والوں کے لیے ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے نئی نئی سہولتیں اور نئی مشکلیں پیدا ہوئیں کئی پرانی الجھنیں دور ہوئیں اور نئے مسائل نے جنم لیا۔ کئی امتحان گزرے اور نئی آزمائشیں سامنے آکھڑی ہوئیں آج سے ایک برس پہلے مسلم عوام نے شاہی ایوانوں سے حکومت کا نفرت انگیز جھنڈا اوج پھینکا اور مسلم لیگ کا سبز علم سرفراز و سربلند نظر آنے لگا۔ اس کے بعد پاگل ہاتھوں سے ہیر رانجھا کی محبت بھری بستیوں میں کشت و خون اور قتل و غارت کی طرح ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان اور پاکستان کی دھرتی خون سے لال اور دونوں ملکوں کی فضا ظلم اور خوف سے مسموم اور تاریک ہو گئی۔ پاکستان کی تشکیل کا دن آیا۔ ایک سمت ایک نیا ملک آزادی کی ترنگ میں چراغاں کا اہتمام کر رہا تھا تو دوسری طرف لاتعداد گھروں میں مسرت اور اطمینان کے چراغ گل ہو رہے تھے ایک طرف فخر و مباہات سے ہر شخص کا سر اونچا تھا تو دوسری طرف غم اور ذلت کے احساس سے سب کی نگاہیں زمیں دوز اور پھر شرق و غرب سے ان گنت خانہ ویراں، سوختہ اختر مخلوق کے کارواں روانہ ہوئے جس کا سلسلہ ابھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ ہمارا نیا آزاد ملک ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہونے پایا تھا کہ اس پر یکے بعد دیگرے کئی پہاڑ ٹوٹے لاتعداد مہاجرین کو بسانے کا کٹھن کام سر پڑا۔ متروکہ اموال و املاک کی تقسیم میں بے پناہ خسارہ اٹھانا پڑا کشمیر کی خوبصورت زمین کو ہتھیانے کے لیے اغیار نے دستِ غصب بڑھایا بسے ہوتے شہر اجڑ گئے چلتے ہوئے کاروبار رک گئے ہمسایہ ملک سے تعلقات کبھی بگڑے کبھی سنورے۔ اسی طرح عالم اسلام، ایشیا اور باقی دنیا میں بھی روشنی اور سائے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے۔

آگے چل کر ہمارے وطنِ عزیز پاکستان اور پاکستان کے رہنے والوں کا کیا ہوگا باقی اسلامی

ممالک کا مستقبل کیا ہے، ہم ایشیا کے فلاکت زدہ مظلوم عوام، اجنبی بردہ فروشوں کے چنگل سے کب چھوٹیں گے دنیا بھر کی مخلوق جنگ اور تباہی کے ڈر سے کب آزاد ہوگی۔ ان گنت مائیں، بچے بیویاں اور شوہر موت اور جدائی، بھوک اور تباہی کے بڑھتے ہوئے سایوں سے بچ کر کب چین اور اطمینان کا سانس لیں گے یہ مسائل ایسے ہیں کہ جن کے متعلق افہام و تفہیم، غور و فکر کی جتنی بھی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں کم ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پڑھنے والے اپنے دیس اور باقی دنیا کے حالات کا صحیح اور بے لاگ اندازہ کر سکیں اس کے لیے کسی خاص عقیدہ یا نقطہ نظر کو ان پر ٹھونسنے کے لیے جبر دل میں طمع اور رنگ سازی سے احتراز کیا جائے ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں دنیا کی کوئی قوم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چن کر بسر اوقات نہیں کر سکتی اس لیے پاکستان کے عوام کو اپنے مسائل اور سیاسی مسالک کو ایک حد تک باقی دنیا کے مسائل اور مسالک سے منطبق کرنا ہوگا۔ اس کے لیے دنیا کے بدلتے ہوئے سیاسی نقشے پر ان کی نظر جمی رہنی چاہیے ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سب سے بڑی دولت ہمارے وسیع میدان، اور فلک آسا پہاڑ ہمارے لہلہاتے ہوئے کھیت، بہتے ہوئے دریا، ہماری مدفون معدنیات یا معلوم دیوی خائر نہیں ہماری سب سے بڑی دولت ہمارے عوام ہیں پاکستان کی عظمت اور خوش حالی کے سب سے اہم کفیل وہی ہیں اور اس عظمت اور خوش حالی کا وارث اول بھی انھیں کو ہونا چاہیے۔ اس لیے ہمیں لازم ہے کہ ہر سیاسی و سماجی یا اقتصادی مسئلہ کو ان ہی شاکر اور بے زبان عوام کی نظر سے دیکھیں اور ان کے مسائل لاتعداد ہیں پاکستان کی حکومت ہماری قومی حکومت ہے اس لیے آج کل سب لکھنے والوں کو ایک دہری سفارت سپرد ہے۔ عوام کی سفارت حکومت کے ایوانوں میں اور حکومت کی سفارت عوام کی مجالس میں اس سفارت میں تنقید کا حق بھی شامل ہے کوئی سفیر یا کوئی نقاد اپنی ذات کو اپنے خیالات، در اعتقادات سے الگ نہیں کر سکتا۔ ہمیں بھی یہ دعویٰ نہیں ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ اول پاکستان کے عوام کے سیاسی

اور جمہوری حقوق کا پورا تحفظ ہو، دوم پاکستان کے مادی ذرائع اور ذخائر کی پوری درآمد اور اکتساب اور منصفانہ تقسیم کی جائے۔ یہ دونوں باتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک داخلی اور خارجی طور پر امن و آشتی کی بنیادیں مستحکم اور استوار نہ ہوں اور دنیا کا کوئی حصہ بدامنی اور خوف سے اسوقت تک مصئون نہیں جب تک کہ تمام اقصائے عالم میں امن آزادی اور جمہوریت کے دشمن مغلوب نہیں ہو جاتے۔

عبداللہ ملک

فیض کا فلسفہ زیست

اُس کے آپنے خطوط کی روشنی میں

فیض ہشت پہلو شخصیت کے حامل ہیں، ہر پہلو اپنے اندر ایک دنیا پوشیدہ رکھے ہوئے ہے اور چونکہ زندگی کے ان اکثر برسوں میں انھوں نے بے پناہ تجربات کیے ہیں اس لیے انکی شخصیت اور بھی متنوع اور ساتھ ہی متنازعہ فیہ بھی بنتی جارہی ہے۔ یہ فیض کی شخصیت کا تنوع ہی ہے جو انھیں اشرافیہ میں جنم لینے کے باوجود طبقہ محرومین کا دم بھرنے پر مجبور کرتا رہا ہے اس تنوع میں انھوں نے کون کون سے پاپڑ نہیں بیلے۔ معلمی کی، شاعری کی، ترقی پسند تحریک کے روح رواں بنے۔ فاشزم کے خلاف میدان جنگ کے سپاہی بنے صحافت کی، ٹریڈ یونین کے قائد بنے اور انہی حوالوں سے سیاست کی وادیٔ خارزار کے راہی ہونے کا الزام بھی مسکراتے ہوتے اپنے اوپر چسپاں کروالیا اور راولپنڈی سازش کیس میں ملزم ٹھہرائے گئے۔ غرضیکہ کون سا صحرا ہے جسکی صحرانوردی فیض کا مقدر نہیں ٹھہری۔ یہ تمام سیاحتیں، تمام صحرانوردیاں الگ الگ کتاب کا عنوان بن سکتی ہیں لیکن مجھے اس وقت صرف ان کے جیل سے لکھے گئے خطوط کے بارے میں کچھ باتیں کرنی ہیں

فیض ۹؍مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار کیے گئے اور انھوں نے پہلا خط ۸؍جون ۱۹۵۱ء کو حیدرآباد جیل سے لکھا یہ تمام خطوط انھوں نے انگریزی میں اپنی بیگم ایلس کو لکھے جس وقت یہ خط لکھے گئے اس وقت ان کی اشاعت کا خیال ذہن میں ہوگا بھی نہیں کیونکہ اس وقت تو ان کو اپنی زندگی کے انجام

تک کا علم نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ وہ خود بھی ان خطوط کی اشاعت کے موقع پر لکھتے ہیں۔

" ظاہر ہے یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے۔ نجی خطوط ہیں جو قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، کسی مربوط اور سجیدہ بحث کی تلاش بے کار ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جیل خانے میں رفع الوقتی کے بہت محدود ذرائع میں سے ایک ذریعہ خط و کتابت بھی ہے۔"

نجی خطوط ویسے بھی انسانی کمزوریوں کو واشگاف کر دیتے ہیں اور جیل اور سفر تو ایسے مراحل ہوتے ہیں جہاں انسان چاہنے کے باوجود اپنی کمزوریاں نہیں چھپا پاتا۔ ظاہر ہے ایسے عمل کے دوران جو خطوط لکھے جائیں گے وہ لکھنے والے کے اندر بیٹھے ہوئے انسان کو اور بھی عیاں کر دیں گے۔ اس کی محبتیں، اس کی نفرتیں۔ اس کی جرأت و ہمت، اس کی بزدلی، اس کی کمینگی، خود غرضی سبھی ان خطوط میں نکھر کر سامنے آجائیں گی۔ کیونکہ جیل تو ویسے بھی جگہ ہی ایسی ہے جہاں کمزوریاں جنم پاتی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جیل بھیجنے والوں یعنی حاکموں کا مقصد وہ نہیں ہوتا جس کا وہ اٹھتے بیٹھتے اعلان کرتے ہیں کہ جیل خانہ بگڑے ہوئے اور سماج کے راندے ہوئے انسانوں کی اصلاح کا ذریعہ ہے بلکہ ان کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے چنانچہ ہمارے طبقاتی سماج میں جیل کی زندگی کا فلسفہ ہی کمینگی، خود غرضی، لالچ اور اپنی ذات کی افزائش کا فلسفہ ہوتا ہے قیدی کی زندگی جب چھین لی جاتی ہے اور اس کو سپرد زنداں کر دیا جاتا ہے تو یہ جسمانی اذیت کا ہی عمل نہیں ہوتا بلکہ یہ روحانی عمل بھی ہوتا ہے جو عام طور پر ضمیر کے قیدیوں کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ آزادی سے محروم کر کے ایک چار دیواری میں محصور کرنے کا مطلب کیا ہے کہ اسے ہر وقت یہ احساس دلایا جائے کہ وہ مجبور ہے وہ حاکم کا بندہ ہے وہ چھوٹی سے چھوٹی آسائش بھی جسے وہ باہر کی زندگی میں آسائش سمجھتا بھی نہیں تھا اس سے محروم کر دیا جائے وہ ان آسائشوں کے لیے ترسنے لگے اب اس کی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ یہ محسوس کرنے کی کوشش کریں کہ فیض ۹، مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار ہوتا ہے اور پہلا خط وہ ۷ جون ۱۹۵۱ء کو لکھتا ہے اور یہ خط وہ شروع ہی اس طرح کرتا ہے۔

تمھیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں ہر کام بہت ہی دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لیے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے۔

اب اس سے زیادہ مجبوری کا کیا اظہار ہو سکتا ہے چنانچہ ایک وقت تھا کہ ۱۹۴۶ء تک پنجاب کی جیلوں میں سرخ مرچ نہیں دی جاتی تھی اور جو عام قیدیوں کو دال یا سبزی ملتی تھی اس میں سرخ مرچ ڈالی ہی نہیں جاتی تھی۔ سگریٹ کا تو ذکر ہی کیا اسی طرح سے ماچس کی ایک ڈبی جیل میں نعمت غیر مترقبہ ہوتی تھی اور سیاسی قیدیوں یا بی کلاس کے حامل لوگ عام قیدیوں کی نگاہوں میں قابل تکریم ہی اس لیے ٹھہرتے تھے کہ ان کے پاس سُرخ مرچ بھی ہوتی تھی اور سگریٹ اور ماچس بھی۔ یہ بھی طبقاتی تقسیم ہوتی ہے اور سیاسی قیدیوں اور عام قیدیوں کے درمیان نفرت کی ایک دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جیل انسان سے جو آسائشیں چھینتی ہے وہ کتنی معمولی ہوتی ہیں لیکن جیل کے اندر کتنی اہم صورت اختیار کر جاتی ہیں اس کا اندازہ فیض کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"آج ہمارے کیمپ میں ایک ہلکا سا ہنگامہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک حکم کے مطابق ہمیں دوبارہ رات کو بند ہونے کی ہدایت جاری کی گئی تھی لیکن یہ حکم عمل درآمد سے پہلے ہی منسوخ کر دیا گیا۔ رات کو بند ہونے یا نہ ہونے میں جسمانی طور سے تو کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا لیکن نفسیاتی اعتبار سے یہ فرق کافی اہم ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب راتیں اتنی حسین ہوں جیسی کہ آج کل ہیں۔ کبھی کبھی جب میں رات کو جلدی سو جاتا ہوں اور منھ اندھیرے آنکھ کھل جاتی ہے تو صحن زنداں کے سکوت اور صبح کی دلکشی سے عجیب فرحت اور تسکین ملتی ہے۔ میں بار بار اس کی تکرار نہیں کرنا چاہتا کہ سفر کیسا ہی سست رفتار کیوں نہ ہو منزل قریب ہے۔ اس لئے جو دن باقی ہیں اُن میں ہم جتنی بھی مسکراہٹیں فراہم کر سکیں فراہم کر کے بقیہ دن گزار دیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گی۔"

فیض ان سطور میں ایک طرف چلتے چلتے زندانیوں کی مجبوریوں کا ذکر کرتا ہے تو دوسری طرف

حوصلے بلند کرنے کی بھی باتیں کرتا ہے۔ دراصل ان خطوط میں فیض مجبوریوں محرومیوں اور تلخیوں کا ذکر ضرور کرتا ہے لیکن ان کو خطوط کا موضوع نہیں بناتا چلتے چلتے ان کا ذکر کرتا ہے دراصل بنیادی طور پر امیدوں اور خوش آئند مستقبل کا شاعر ہے اور ہر خط میں وہ باتوں کا اعادہ کرتا ہے اصرار کرتا ہے اور بنیادی طور پر یہی اس کا فلسفۂ زیست ہے جو جیل میں اور بھی نکھرا ہے۔

ان خطوط میں انسانی مسرت اور زندہ رہنے کے ولولوں کا جس طرح اظہار ہوتا ہے وہ شاذ ہی حسیات میں اس سے پہلے ہوگا فیض زنداں کی یاس و ناامیدی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا اسی لیے تو اپنے دوست ہرجیت کا مقولہ دہراتا ہے۔

"تمہارا ۲۳ تاریخ کا لکھا ہوا خط بچوں کی تصاویر سمیت آج ملا۔ تمہارے بچے کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے بڑے نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں اور باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں انہیں اپنے سامنے بڑے ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ تمہاری نگرانی میں ان کی تربیت کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ اُن کی تربیت میں میرا تو اتنا ہی حصہ ہو سکتا تھا کہ انہیں خوش رہنا سکھاؤں اور اُن کی خوب ناز برداری کروں اگر وہ خود غرض، کم ظرف اور حریص نہ بن جائیں (اور مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا) اور اگر اُن میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ کیا چیز باعزت ہے اور کیا نہیں ہے تو وہ جیسے بھی اپنی زندگی بسر کریں ٹھیک ہے۔ ہمارے دوست سُرجیت سنگھ نے کہا تھا PEACE COMES FROM WITHIN" اگر وہ یہاں ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اب صحیح طور سے پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دل میں جرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دکھ درد، سب مفارقتیں، سب سختیاں، سب صعوبتیں، غرض وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے جو باہر سے اُس کی ذات پر نازل ہوں۔ صرف گناہ کا احساس، خطاکاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے جس کا کوئی مداوا، کوئی علاج نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس زندگی بھر اپنے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے

خلاف اگر اپنی نیکی اور بے گنہی پر یقین ہو جیسا کہ اس مصیبت میں مجھے اور تمہیں ہے تو سب بے وجہ کی تکالیف و حادثات شعر کی اصطلاح میں سمندِ شوق کو تازیانے کا کام دیتے ہیں۔"

جیل کی کیفیات پر جس چابکدستی سے فیض نے اظہار خیال کیا ہے اس کی مثال محال ہے اور چونکہ عام قاری اور تنقید نگار بھی جیل کی زندگی سے عام طور پر لاتعلق ہوتا ہے اس لیے وہ زنداں جانے والے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن جن کیفیات سے ان اسیروں کا گذر ہوتا۔ جس رُوحانی کرب سے وہ دوچار ہوتے ہیں اس سے وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنی روح کا حصہ نہیں بنا سکتے۔ جس طرح سے روٹی روزگار کے لیے بیرون ملک جانے والوں کا صرف ایک پہلو ہماری نظر میں ہوتا ہے کہ وہ اتنے ڈالر اتنے ریال، اتنے پونڈ کما رہے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں جو خلا ہوتا ہے ان کے شب و روز میں جو زہر گھلا ہوتا ہے، جو بے کیفی ہوتی ہے اس کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ پاتے اور ہم صرف بجٹ کے موقع پر بیرون سمندر سے آنے والے زرِمبادلہ کا ذکر کر دیتے ہیں سو یہی حال فیض کی جلاوطنی کا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ عیش کر رہا ہے، سیر و سیاحت کر رہا ہے لیکن اس فنکار کو جلاوطنی کا جو کرب اس کو سہنا پڑ رہا ہے اس کو جاننے کے لیے بھی ایک اور فیض درکار ہے

جیل انسان کو چڑچڑا بنا دیتا ہے وہ غصیلا ہو جاتا ہے وہ بات بات پر لڑنا شروع کر دیتا ہے اور بہت حد تک وہ ناامید و مایوس ہو جاتا ہے اسے انسان کے مستقبل پر سے امید اٹھ جاتی ہے۔ لیکن فیض کی انسان دوستی اس کے اعتقادات کی پختگی اور آدرش سے لگن نے اس کو زندہ و توانا رکھا جیل کی تمام صعوبتیں اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کی چمک نہیں چھین سکیں لیکن لطف یہ ہے کہ اس پختگی کے باوجود وہ اپنے خطوط میں نہ لیکچر دیتے ہیں نہ فلسفہ بگھارتا ہے حالانکہ وہ سالہا سال تک معلمی کرتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود کم گو رہا ہے اور خطوط میں بھی کم گوئی موجود ہے۔ وہ ان خطوط میں نہ فلسفی بنا ہے نہ مبلغ۔ اور تو اور وہ منتخبوں اور محرومیوں پر بھی غیض و غضب کا اظہار نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کی تحریروں سے کسی قسم کے غم و غصہ کا

اظہار ہوتا ہے بلکہ وہ تو اپنے دشمنوں سے بھی ناراض دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ جگہ جگہ اس کی تحریروں سے ان کے لیے جذبہ ترحم مترشح ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتا ہے۔

" تمہیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں ہر کام بہت دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لیے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے میں اور دوسرے ساتھی چار تاریخ کی صبح کو اسپیشل ٹرین کے ذریعے یہاں پہنچے ہم نے جس ٹھاٹھ سے سفر کیا دیکھنے کی چیز تھی صرف بلیڈ باجے کی کسر رہ گئی ورنہ جلوس اور تو سب کچھ تھا۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہی یوں محسوس ہوا کہ سب پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔ سفر کا لطف، دنیا کو دوبارہ دیکھنے کی لذت، پرتکلف کھانا، بہت سی نعمتیں یک بارگی ہاتھ آ گئیں اس دور دراز دن کے بعد مجھے اچانک گھر سے گئے تھے پہلی بار مرے کا کھا اس سفر کی دو دیر نصیب ہوا۔ بھنا ہوا مرغ ۔ پلاؤ، فروٹ کاک ٹیل اور آئس کریم (افسوس کہ بھوک نہیں لگ رہی تھی اور اس پر اضافہ دنیا کی سب سے عزیز چیز یعنی انسانوں کی صحبت جس سے اتنے دن محروم رہے۔ "

ان سب باتوں کی وجہ سے دل دوبارہ پرسکون ہے اب تمہیں بتانے میں کچھ ہرج نہیں کہ یہ تین چار دن جو لاہور میں گزرے ایام اسیری کے سب سے اذیت ناک دن تھے جب مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیت پہنچانا جو خود کو بہت عزیز ہو لیکن ان کے لیے کچھ معنی نہ رکھتی ہو غلط اور ناجائز بات ہے اس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خود غرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے اس لیے اپنے کسی اصول کی دھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دل دکھاتے ہیں اس زمانے میں دل و دماغ پر اور بھی کئی باتوں کا انکشاف ہوا اپنے بارے میں بھی دوسروں کے بارے میں بھی اپنے میں ایسی بہت سی کمزوریاں نظر آئیں جن کا وجود پہلے گمان میں نہ تھا دوسروں میں کمینگی اور عالی حوصلگی کے ایسے پہلو دکھائی دیے جو پہلے معلوم نہ تھے اس سارے تجربے کے لیے دل احسان مند ہے خیال ہے کہ جب یہاں سے نکلیں گے تو غالباً اپنی شخصیت پہلے سے زیادہ مکمل اور منظم ہوگی میں نے یہ بھی اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ آدمی کے

مناسب یہی ہے کہ جو کچھ وہ ہے اس پر قناعت کرے اور جو کچھ وہ نہیں ہے وہ کچھ بننے کی کوشش میں وقت اور محنت ضائع نہ کرے اس طرح کی کوشش سے حماقت اور خود فریبی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں۔

ہاں تو جیسے میں کہہ رہا تھا جب سے میں یہاں پہنچا ہوں خوف و خطر کا قطعی کوئی احساس دل میں باقی نہیں رہا (اگرچہ یہ احساس پہلے بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا وہ اس وجہ سے کہ نہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جسے اخلاقی طور سے گناہ کہہ سکیں بلکہ کوئی ایسا ارتکاب بھی نہیں کیا جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے اب تو یوں ہے کہ اگر کوئی یاد نہ دلائے تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم جیل خانے میں ہیں یوں لگتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں ہیں اور اگر یہاں سے باہر جانے کو جی چاہے تو کوئی ہمیں روک بھی نہیں سکتا۔ جیل میں ہمارا گھر اچھا خاصا ہے کھانے پینے کو کافی ملتا ہے گرمی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اسیری کے سب سے بُرے دن کٹ چکے ہیں اس لیے کہ اب اور کچھ بھی ہو، نہ قیدِ تنہائی کا سامنا باقی ہے نہ پولیس کی تفتیش وہ پوچھ کچھ کا ڈر ہے اور اپنی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں اب تمہاری اور اور بچوں کی تصویریں سامنے رکھ کے میں خوشی سے مسکرا سکتا ہوں، تمہاری یاد سے پہلے کی طرح دل نہیں دکھتا اور یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ محکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھلاتے بالآخر بہت خوب ہے بھی ہے اور بہت حسین بھی۔"

اس قدر کٹھن حالات میں مسکراتے رہنا یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ یہاں پر تو لوگ "نوائے وقت" کے ایک جملے سے لرزاں و ترساں ہو جاتے ہیں اور ایک فیض ہیں کہ وہ ربع صدی سے نوائے وقت کی گھن گرج کے تمام وار، ہنستے کھیلتے سہے چلے جاتے ہیں اور کوئی حرفِ شکایت ان کے لب پر نہیں آتی ہم ان کے چاہنے والے شکایت کناں ہوتے ہیں۔ لیکن مجال ہے فیض نے کبھی ایک حرف بھی "نوائے وقت" کے بانی حمید نظامی کے خلاف کہا ہو بلکہ ہم جو پرانے دور کے لوگ ہیں ہم سے تو اکثر حمید نظامی مرحوم کی اچھائیاں ہی

بیان کرتے ہیں۔ دراصل دنیا کو جاننے اور دنیا والوں سے نباہ کرنے کا ایک یہ بھی اسلوب ہے جو مسلسل ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے دراصل فیض نے مسلسل ریاضت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے اور سچ یہ ہے کہ فیض اس میدان میں کسی صوفی سے کم نہیں ہیں۔

فیض کو یہ مقام اس کی انسان دوستی نے عطا کیا ہے انسان دوستی کا جذبہ اس کی رگ و پے میں سرایت کر کے اس کے خون کا حصہ بن گیا ہے اس کی شخصیت اس انسان دوستی کے بغیر جانی ہی نہیں جا سکتی۔ فیض کی واحد پہچان، فیض کا تشخص، فیض کا آدرش ہی انسان دوستی ہے چنانچہ ان نجی خطوط کے اقتباسات فیض کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں وہی فیض جو مکمل انسان نظر آتا ہے۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔

"—————— مجھے تمام وقت یہ خیال ستاتا رہا کہ مسرت اور خود فراموشی کے چند لمحے گزر جانے کے بعد ان بے چارے بیوی بچوں کے دل میں رنج و فراق کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو جائے گا۔ لذت پرستی کے فلسفے میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اگر وقتی لذت کے بعد اس لذت سے زیادہ دکھ اٹھانا پڑے تو اس لذت سے گریز کرنا چاہئے۔ اس سوال کا حل مشکل اس لئے ہے کہ اس لذت اور درد کا تناسب پہلے سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم زندگی کی چھوٹی موٹی تفصیلات میں اتنے الجھے رہتے ہیں کہ اخلاق و فلسفے کے بے کار مسائل سے الجھنے کے لئے نہ وقت ہے نہ دماغ۔ مثال کے طور پر ابھی کچھ دن پہلے ہمیں ایک ریڈیو سیٹ عنایت ہوا تھا اور سب لوگ اس میں ایسے ہی منہمک رہتے ہیں جیسے چھیمی اپنے فلمی گانوں میں۔ پھر ہمارے وارڈ کی کالی بلی نے دو تین بہت نازک سفید اور سیاہ بچے دیئے اور سب لوگ پرورش اطفال کے پیچیدہ مسائل میں غرق ہو گئے۔ اس کے بعد عید کے کھانے کی تفصیلات پر بحث و تکرار شروع ہوئی۔ ان کے علاوہ بیسیوں مسائل اور بھی ہیں مثلاً کوٹھریوں کے پردے کیسے ہوں گے؟ پڑھنے کی میزیں کب ملیں گی؟ صبح کی چائے

کس وقت آئے گی وغیرہ وغیرہ اور اس تمام مدت میں یکساں دنوں کی ساکن سطح پر یاد کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور وقت کی نبض دیکھتے دیکھتے سست رفتار ہوتی جا رہی ہے۔ اب دن چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور صبح جب ہم چائے کے لئے اٹھتے ہیں تو رات کا اندھیرا کچھ کچھ باقی ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے سالوں کے بعد شب کے خاتمے پر اندھیرے میں پو پھٹنے کا سماں اور چاند کے ہلکے نقرئی رنگ کو روپہلی بنتے دیکھا ہے۔ جیل کی دیواروں کے باوجود یہ سب کچھ حسین ہے اور ایسے لمحوں میں زندگی کی سب بے وفائیوں کے باوجود اس کا شکرانہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"آج تمہارا خط ملا، بڑی راحت ہوئی۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ دعا ہے کہ تمہیں (بلکہ ہمیں) یہ دن کئی بار دیکھنا نصیب ہو۔ ان دس برس میں ہم نے بہت سا سکھ دیکھا ہے اور تھوڑا سا دکھ بھی۔ لیکن ہم نے یہ تمام دن دیانت داری اور سکون خاطر سے گزارے ہیں اور زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے، تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں، یہ دس برس ایسی دولت ہیں جسے کبھی فنا نہیں اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اگر کسی کا عقبیٰ یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ حق و صداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے کوئی رہزن لوٹ نہیں سکتا۔ نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے۔ شاید مذہبی اصطلاح میں توشۂ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں۔

تم نے اپنے گھر کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی کتنی کڑی اور جدائی کے یہ لمحے کتنے گراں ہیں۔ ان کو دل سے دھویا تو نہیں جا سکتا لیکن ان کا بوجھ اس تصور سے کم ضرور کیا جا سکتا ہے کہ بیتے ہوئے دن کیسے اچھے تھے اور آنے والے دن کتنے بہتر ہوں گے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ جب سے جیل خانے کا دروازہ بند ہوا ہے کبھی کبھی ماضی کے پیرہن کو تار تار کر کے اسے مختلف صورتوں میں دوبارہ بنتا رہتا ہوں اور کبھی آنے والے دنوں کو دام

تصور میں مُقیّد کر کے ان سے اپنی مرضی اور پسند کے مختلف مُرقعے ترتیب دیتا رہتا ہوں جانتا ہوں کہ یہ بیکار سا شغل ہے اِس لئے کہ خوابوں کو حقیقت کی زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آدمی تخیّل کے بَل پر گردوپیش کی دلدل سے پاؤں چھڑا سکتا ہے۔ فراریت بُری بات ہے لیکن جب ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں تو آزادی کی واحد صورت یہی رہ جاتی ہے۔ اِسی نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہُت ہی حقیر اور بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں اور بیشتر اوقات اُن کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔"

"تمہارا دوسرا خط مجھے ابھی ملا، غالباً میرا پہلا خط پہنچ گیا ہوگا۔ مجھے خیال ہے کہ میں نے ہماری شادی کی سالگرہ کی تاریخ پھر غلط لکھی۔ لیکن اَب کے ایک ہی دن کا فرق تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ دن اِتنا اہم نہیں جتنے وہ روز و شب ہیں جو اُس دن کے بعد آئے۔ اُن سارے دنوں کی یاد اور اُن سب نعمتوں کا احساس جو زندگی نے عطا کی ہیں، بہُت سے لوگوں کی دوستی اور محبت، تمام بہاریں، سَب برساتیں صبحیں اور شامیں، غروبِ آفتاب اور طلوعِ ماہتاب، الفاظ، اصوات، رنگ و بُو کا حسُن، لُطف و انبساط کی بے انت واردا تیں، ان سَب باتوں سے جیل کی بے رونقی میں دل پر ایسی مسّرت طاری ہوتی ہے جس سے ہم پہلے آشنا نہ تھے۔ اگر دو چار دوستوں نے دغا کی یا زندگی میں درد و کراہت کے چند لمحے پیش آئے تو اِن نعمتوں کی میزان کے سامنے اُن کی کیا وقعت ہے۔ کچھ بھی نہیں یہ احساس پوری طرح جیل جانے ہی میں میسّر آسکتا ہے اس لئے کہ جیل خانے کی دُنیا باقی دُنیا سے الگ تھلگ ایک دُنیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک طرح کی "اگلی دُنیا" ہے جو روزمرہ دُنیا سے اِتنی دُور دراز اور ایسی بلند و بالا معلوم ہوتی ہے کہ اُس کی نارسا بلندیوں پر سے انسان نیچے کی انسانی دُنیا کو بہت بسیط اور جامع نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو۔ ہم تو بیشتر اوقات اِدھر دیکھتے ہی نہیں، دامنِ دل کھینچے کے لئے ہر گوشۂ تنہائی کی اپنی دلچسپیاں"

بھی بہت ہوتی ہیں"۔

"تمہارے خط پہلے سے زیادہ بشاش معلوم ہوتے ہیں جو خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ شاید تم نے یہ بشاشت مجھے خوش کرنے کے لئے اختیار کی ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل خوش ہوتا ہے۔ ہمارے دوست اور بہی خواہ اپنا من بہلانے کے لئے جو خوش آئند افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ میں انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن ان افواہوں سے قطع نظر اس میں کیا شبہ ہے کہ آخر کار حالات سدھر ہی جائیں گے۔ جو بھی دن گزرتا ہے اس سے نجات کی منزل کا فاصلہ اور کم رہ جاتا ہے چنانچہ اس آزمائش کے خاتمے تک محض صبر و تحمل درکار ہے ہاں اس خیال سے تسکین اور تسلی ضرور ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہمیں بھولے نہیں اور ہماری امداد کے لئے اُن کے دل میں ہمدردی موجود ہے اور جب اس ہمدردی کا اظہار ہم عصر دنیا کی ایک ایسی عظیم شخصیت کی جانب سے ہو جیسے کہ پال رابسن ہیں تو افتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے"۔

The Diplomat مصنف James Aldridge ہیں اور Bodley Head نے شائع کی ہے۔ میں نے بہت زمانے سے ایسی اچھی کتاب نہیں پڑھی۔ تم بھی کہیں سے حاصل کرنے کی کوشش کرو تاکہ جو لطف مجھے ملا ہے اس میں شریک ہو سکو۔ ناول کا موضوع تو ایران میں برطانوی ریشہ دوانیاں ہے لیکن اس کی خوبی موضوع کی وجہ سے نہیں ہے خوبی اس اخلاقی اور جذباتی کشمکش کے بیان میں ہے جو عالمگیر قوتیں ایک فرد کی ذات پر نازل کرتی ہیں اور اس بارے میں کہ یہ اکیلی جان اس کشمکش کی صلیب سے کیسے عہدہ برا ہوتی ہے۔ ایک طریقے سے اس میں اس بے چارگی اور مایوسی کا جواب ملتا ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ یہ احساس ہمیں اس لئے گھیرے رہتا ہے کہ انسانی مسرت کی جدوجہد بظاہر اتنی طویل اتنی گراں اور اتنی دائمی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایک فرد کی ذات بالکل ہیچ اور نزار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ جبھی ہوتا ہے اگر تم اس جدوجہد کو ایک فرد کی نظر سے دیکھو بلکہ یہ کیفیت پیدا

ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم انسانی رنج و ناخوشی کے مسئلے کو ذاتی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ان مسائل کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنا حماقت ہے اس لیئے کہ انسانی رنج و راحت ہمارا تمہارا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے جیسے کسی شخص سے عاشقی یا اپنے بچے کی علالت ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر یوں نہیں ہے تو اسے دیکھنے کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے۔ اور وہ اجتماعی نقطۂ نظر ہے۔ اگر اس نظر سے دیکھو تو یہی جدوجہد شجاعانہ، بامقصد اور امید افزا نظر آتی ہے۔ اس طور سے مسائل پر نگاہ ڈالنا مشکل اس لیئے ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی خودپسندی کی وجہ سے کبھی پوری طرح اقرار نہیں کرتے کہ ہماری ذات قطعی غیر اہم ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل یہی خودپسندی ہے یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا۔ افسردگی، بددلی اور خود ترحمی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گلہ کارفرما ہوتا ہے کہ ساری کائنات ہماری ذاتی تمناؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔ دراصل ہمارے تمہارے جیسے لوگ جن کی شخصیتیں بالکل مکمل اور مربوط نہیں ہیں اپنی ذات کو اس ذات کی حدود سے پرے زیادہ بڑی چیزوں سے یک جاں نہیں کر سکتے جس کے نتیجے میں ناخوشی اور شکست کا احساس لازمی ہے۔ اس امر میں شائد میں تم سے زیادہ قصوروار ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک قسم کی خودپسندی ہے مگر شائد مختلف اور زیادہ گھٹیا قسم کی۔"

"______________ تمہاری قوت برداشت پر دل بہت نازاں ہے۔ شاید میں نے لکھا تھا کہ اپنی شخصیت کی گہرائیوں کا کم از کم ایک بار امتحان ضرور ہونا چاہیئے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ وہاں کیا ہے کیا نہیں ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایسے ہوں گے جنھیں کبھی نہ کبھی یہ امتحان پیش نہ آئے۔ اگرچہ بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی باری کبھی نہیں آئے گی۔

اگر اس قصے کا خاتمہ بالخیر ہوا اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو سارے دکھ درد کے باوجود یہ سودا سود مند ثابت ہوگا۔ اس کا موذی اور غیر اخلاقی پہلو صرف ایک ہے اور وہ ہے بیش قیمت وقت کا مجرمانہ زیاں۔ عمر کے غلط حصے کا ایک پورا سال ختم ہو چکا ہے اور بہت تھوڑے

وقت میں جو بہت کچھ کرنے کو ہے اس میں سے کوئی بھی کام پورا نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے جیل خانے کی لغویاتی اُلجھنیں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس جبری فراغت سے کوئی مُفید کام نکل سکے اگرچہ اس کا احساس اور اس کی تمنا دل میں مُستقل رہتی ہے۔[۱۱]

"خط و کتابت میں ہم پھر پیچھے رہ گئے ہیں اس لیے کہ تمہارے تین خط یکبارگی وصول ہوئے جس سے دل خوش بھی ہے اور نادم بھی۔ مَیں کوشش کروں گا کہ یہ حساب برابر ہو جائے۔ شاید تمہیں عجیب لگے لیکن یہاں خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب یہاں اُن چیزوں کی یاد جو دل کو عزیز ہیں زیادہ ستانے لگے تو یہ یادیں اتنی شفیق خوبصورت اور گرمانے والی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے مدوجزر میں رکاوٹ ڈالنے کو دل نہیں چاہتا۔ تم کہو گی کہ یہ اپنی کاہلی اور سہل انگاری کا جواز پیدا کرنے کا ایک بہانہ ہے اور تمہارا کہنا ٹھیک بھی ہے مَیں نے شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ جیل خانے کی زندگی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں وافر اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی ذہنیت کا کبھی ایسا صحیح شعور پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے۔ یہ ذہنیت ہر قیدی کی عام ذہنیت ہے اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی اُلجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالمگیر مسائل دکھائی دینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلقی، کینہ پروری، بدمزاجی، کبھی خودسری کبھی خاک بوسی کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے قطعی گریز اور کبھی بے وجہ کی بھاگ دوڑ یہ سب باتیں مقیّد اور محکوم زندگی کے عام ذہنی اور عملی لوازمات ہیں جو آسانی سے آزاد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن اِن سب باتوں کے باوجود کچھ اچنبھے یہاں کی زندگی میں بھی ہوتے ہیں پتلا لگے دن میں نے دہلی سے ہندوستانی موسیقی کے لئے ریڈیو کھولا ہمارے پاکستانی ریڈیو پر جو چیز موسیقی کہلاتی ہے اس میں بعض عطائی لوگوں کی چیں پیں کے علاوہ کچھ سننے میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سب اچھے موسیقار برکت علی خاں، رفیقؔ، بکھراج وغیرہ وغیرہ ریڈیو والوں پر حرام ہیں اتو معلوم

ہے ہم نے کیا سُنا۔ تم کبھی نہیں بوجھ سکو گی۔ ریڈیو پر اس زمانے کے سب سے بڑے وائلن بجانے والے YEHUDI MENUHIN انڈین فلم فسٹول ہال میں BACH اور PAGANNINI کے نغمے بجا رہے تھے۔ بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں سوچا تو بہت رشک بھی آیا اور غصّہ بھی۔ اس مُلک کو قائم ہوئے پانچ برس ہو چکے ہیں اور اس پانچ برس میں ہم نے اپنے لوگوں کے لئے حُسن، تہذیب اور پاکیزہ فرحت کا کوئی بھی سامان فراہم نہیں کیا۔ اگرچہ اس دوران میں اور طرح طرح کے " تماشے" ہر روز برپا ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف یہی سوجھتا ہے کہ دُنیا بھر کے خالی الذہن رٹے بوڑھوں کو یک جا کریں پھر اُن سے خرافات کا طومار اُگلوائیں جنھیں کوئی بھی رتّی بھر اہمیت نہیں دیتا۔ یا یہ کریں کہ کچھ لوگوں کو نشستن و خوردن اور گلا پھاڑنے کی سہولتیں ہم پہنچائیں اور پھر برخاستن کے بعد یہ سب کچھ بھول جائیں۔ ہندوستان ہم سے بڑا مُلک سہی لیکن کلچر یا تہذیب کا تعلق مُلک کے سائز سے نہیں ہوتا۔ سوچنے اور رہنے سہنے کے آداب و اطوار سے ہوتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے مُلک کے لوگ اگر بہت عمدہ تہذیب برت نہیں سکتے تو کم از کم اُس کے ہوتے تو دیکھ سکیں۔ خیر شاید کبھی نہ کبھی ایسے دن بھی آئیں گے اور شاید مجھے اس بارے میں لکھنا بھی نہ چاہیے۔"

" یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ اب بھی ایسے لوگ باقی ہیں جنھیں ہم جیسے راندۂ درگاہ لوگوں کی صحت میں دلچسپی ہے۔ ہماری صحت جس پر یہاں کے سب لوگ رشک کرتے ہیں بالکل اوّل درجے کی ہے البتہ اس سے تھوڑی سی تشویش ہے کہ لائل پور جیل میں جو وزن گھٹا یا تھا وہ دوبارہ بڑھنے لگا ہے۔ ۱؎ کے بارے میں سُن کر رنج ہوا۔ نہ جانے ایسی کتنی لڑکیاں ہوں گی جنھیں زمانے کی شقاوت اور خود غرضی نوجوانی میں مایوسی اور ذلّت کا شکار بننے پر مجبور کرتی ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف ان کی اپنی زندگی میں بدی کا زہر گھُل جاتا ہے بلکہ پھر یہی

۱؎ ہمیں نام ظاہر کرنا نہیں چاہئے۔

زہر ان کے ذریعے سے کئی دوسری زندگیوں میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ اس کا الزام کس پر ہے اور آدمی گناہگار کسے ٹھہرائے؟ اس اجتماعی دُکھ درد کے علاوہ جو صرف معاشرتی انقلاب ہی سے دُور ہو سکتا ہے انفرادی رنج و ملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں جو تھوڑی سی محبت شفقت اور سمجھ بُوجھ سے اگر دُور نہیں کئے جا سکتے تو کم ضرور کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن محبت اور شفقت کی طلب میں پکارنے والے اتنے زیادہ ہیں اور دینے والے اتنے کم کہ دردِ جگر اور شکستِ دل کا مداوا دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ بہرحال اسکی تلاش میں تگ و دو پھر بھی لازم ہے اور جیسا کہ تم نے لکھا ہے اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ آدمی دوسروں سے نیکی کرتا رہے البتہ اس کے عوض میں کسی صلے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہیئے ورنہ یقیناً مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اگر آدمی نیکی کے عوض میں نیکی کی توقع رکھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دُنیا کا نظام بجائے خود نیک ہے ظاہر ہے کہ یہ سوچ غلط ہے اس لئے کہ ایک نیکوکار نظام میں سبھی کو نیک ہونا چاہیئے اور کسی کو خاص طور سے نیکی کرنے کے لئے زحمت اُٹھانے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔"

۲۔ تمہارے دو خط ملے۔ ایک آج اور دوسرا ایک دن پہلے۔ دوسرا خط پڑھ کر خاص طور سے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ نوجوان حسیناؤں کی صف سے ہمارے مدّاح کب کے رخصت ہو چکے ہوں گے۔ اِن میں تو اپنا چرچا اُس زمانے میں تھا جب ہم شعر میں عاشقانہ رونا دھونا کیا کرتے تھے۔ اگر انہیں ہمارا کلام اب بھی پسند ہے تو اس کا مطلب ہے کہ نئی نسل ایسی کم عقل نہیں جیسا کہ ہم سمجھتے تھے۔ اور انہیں بالغ زندگی کے وسیع تر اور عمیق تر جذبات کا شعور بھی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور زیادہ خوش کُن ایک عام آدمی کی رائے ہے جو تم نے بیان کی ہے۔ اس لئے کہ اپنے ذاتی سکونِ خاطر کے علاوہ رائے عامہ کا تعلق اس حقیقت سے بھی ہے جس سے ہمارا مستقبل وابستہ ہے۔ اس وقت یہ تعلق شاید دُور کی بات معلوم ہو لیکن دراصل یہ دُور کی بات نہیں بالکل فوری اور سامنے کی حقیقت ہے اس لئے خاطر جمع رکھو۔"

"______ یہ حسن جیسے زندگی کبھی کبھی بے نقاب کرتی ہے کیسی عشوہ طراز اور کیسی سیماب صفت چیز ہے اور زندگی اسے آشکار کرنے کے لئے کیسے عجیب و غریب لمحے اور کیسے عجیب و غریب مقامات انتخاب کرتی ہے بعینہ ہمارے قدیم محلّوں کی کسی پردہ نشین حسینہ کی طرح۔ اور شاید اسی وجہ سے اس حسن سے لو لگائے رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گزشتہ بار اپنی نظمیں تمہیں براہ راست نہیں بھیجیں آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ ٹ کے بارے میں تمہاری رائے مجھے معلوم ہے اور مجھے اس سے کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت سے زاویے ایسے ہوتے ہیں جنھیں پیش نظر رکھنا چاہیے، اُن پر پوری طور سے سفید و سیاہ کا حکم لگا دینا ٹھیک نہیں۔ ان ہی صاحب کی مثال لے لو۔ وہ جیسے ہیں، ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک زمانے میں بہت سے اچھے لکھنے والوں کو عوام سے روشناس کروانے اور انہیں روزی بہم پہنچانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ اور جب ان سے بہتر لوگ تحریک کا ساتھ چھوڑ گئے تھے تو یہ ایسے ساتھ رہے یہ صحیح ہے کہ اس میں ان کا تجارتی مفاد بھی تھا اور بعض اوقات انہوں نے لوگوں کی احتیاج سے فائدہ بھی اُٹھایا لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور اس سے تصویر کے دوسرے رُخ کی نفی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے حق و ناحق کے DOWN RIGHT فلسفے میں اس طرح کی موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے لیکن تمہیں اس نسبتاً کمزور مخلوق کو بھی برداشت کر لینا چاہیے جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔"

"______ میں صرف جسمانی تکلیف کا نہیں سوچ رہا ہوں اگرچہ وہ بھی اپنی جگہ صبر آزما چیز ہے مجھے زیادہ خیال اُس شگفتگی اور خوش مزاجی کا ہے جو اپنے اندر ہوتی ہے اور جسے بہت زیادہ جسمانی سختی چوس لیتی ہے۔ پھر جب کلیجہ جل بھُن کر کباب ہو جاتا ہے تو آدمی زندگی کے حسن و خوبی سے لطف اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ مشکل سے مشکل

اور تلخ سے تلخ زندگی میں بھی لطف و انبساط کا کچھ نہ کچھ سامان بہم رہتا ہے جس سے محرومی کسی طرح برداشت نہیں کرنی چاہیئے۔ جب کاروبارِ کائنات بہت ہی نامنصفانہ اور غیر معتدل ہو تو کچھ نہ کچھ تلخی تو ضرور محسوس ہوگی لیکن اس تلخی کو اُس سرور و تحیّر پر غالب آنے نہیں دینا چاہیئے جو نعمتِ زندگی کی عطا ہیں اور جن کی وساطت سے حسنِ کائنات کے مخفی خزینے بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔"

"تمہارے جس دوست کی بیوی کے بارے میں تم نے پوچھا ہے اُن کا مسئلہ وہی ہے جو اور ہزاروں لاکھوں کا ہے یعنی جائداد اور روپے پیسے کے جھگڑے۔ جب تک ذاتی ملکیت کا موجودہ نظام قائم ہے اس مسئلے کا کوئی قطعی حل تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہر ذاتی مسئلے کی طرح اس سے نپٹنے کی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اُس سے بلند و بے نیاز ہو جائے اور دوسرے یہ کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ دوسری صورت کچھ ایسی سُود مند نہیں اس لئے پہلی ہی صورت کا کوئی نسخہ برتنا چاہیئے، اس کی خاطر ظاہر داری، مصلحت کوشی، لجاجت، تغافل جو کچھ بھی کرنا پڑے ٹھیک ہے تاکہ اپنے اور دوسروں کے رنج و ناخوشی میں کچھ کمی ہو سکے، یہ کوئی سیدھا اور بندھا ہوا نسخہ نہیں ہے۔ جس کسی سے جیسے بھی بن پڑے ویسے کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ بار آور زیادہ بامعنی اور زیادہ اہم چیزوں پر مرکوز رکھے جو ایک طرح سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما راستہ ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود ہی نہیں۔"

"FOR SINGING TOMORROWS" بہت حسین ترکیب ہے۔ ہاں سب کچھ آنے والے نغمہ سنج دنوں کے لئے ہے۔ آج کا دُرد بھی، آنسو بھی، کلفت بھی اور محرومی بھی اور اگر آج کا دن موجود ہے تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اس طرح ہر دُکھ بھرا دن جو گزرتا ہے۔ اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ تسکین ساتھ لاتا ہے کہ جو دن گزر چکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکا اور اُس کے بعد جو بھی دن آئے گا اُس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو، اس لئے لازم یہی ہے کہ آنے والے دنوں یہ

نظر جمائے رکھیں گے اور بیتے ہوئے دنوں کو جملہ ساکنانِ عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں"۔

"اگرچہ مجھے اپنے دل میں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اگر ہمیں کلفت اور انتظار کے کچھ اور دن بھی بسر کرنے پڑے تو مجھے اس سے بھی قوی یقین ہے اور اُمید اور تحمل کے سہارے ہم انھیں بھی گزار دیں گے۔ جب تک زندگی باقی ہے کسی مصیبت کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ کسی نہ کسی طرح سب نقصانات پورے ہو جاتے ہیں اور سب دکھ درد کی تلافی ہو جاتی ہے، اہم چیز صرف اپنی زندگی اور اپنی جاں ہے جو جیر تمام بھی ہے اور اُمید برحق بھی۔ اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی باقی ہے۔"

"_______________ دانشمندی اسی میں ہے کہ ناگوار صورتِ حالات کا امکان بھی پیشِ نظر رہے، آئندہ کے بارے میں انسانی علم بہت محدود ہوتا ہے اور تکلیف دہ حادثات کے امکانات ہمیشہ موجود، اس لئے ہر کسی کو اس حد تک فلسفی ضرور ہونا چاہیئے کہ جو بھی صورت پیش آئے اُسے زیادہ ششدر یا سراسیمہ ہوئے بغیر قبول کرلے۔ ہم تو اس بارے میں بہت زیادہ فلسفی ہیں۔ اوّل یہ جانتے ہوئے کہ خیر کی ہار کبھی نہیں ہوتی اور دوم یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میں اتنی ہمت اور سمجھ بوجھ موجود ہے کہ کل جو بھی سامنے آئے گا تم اُسے دلجمعی اور حوصلے سے برداشت کرلو گی۔ اصل میں نہیں یہی کچھ کہنے کے لئے بلایا تھا اگرچہ یہ سب کچھ کہنے کی ایسی کچھ ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ دئی خاص معاملہ نہیں جسے فوری طور پر حل کرنا ضروری ہو۔ کبھی فراغت سے سب باتیں طے کرلیں گے گھر بیٹھ کر یا جہاں بھی مقدّر ہمیں ملنے کی اجازت دے۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ادھر جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس سے تم کوئی اور نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرو۔ یا کوئی نئے وسوسے اپنے دل میں لاؤ۔ یہاں کی صورتِ حال میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ وہی صورت ہے جو ہمیشہ سے تھی یعنی اُمید کا ایک دودھیا بادل ہے اور اُس کے ساتھ بے یقینی کی ایک سیاہ

دھاری۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے معنی صرف اِس قدر ہیں کہ اِس سیاہ دھاری کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔"

" اس سے پہلے مجھے اس بات پر بڑا مان تھا کہ اپنے ہیں اور جو بھی عیب ہو ہم نے جان بوجھ کر کسی کے دُکھ میں اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ مان بُری طرح لوٹ چکا ہے اگرچہ اس میں کبھی خطا میری نہیں۔ جیسے تم نے لکھا ہے تمہارے ابا کی علالت میں بھی زیادہ دخل اپنی بچیوں کی ناگہانی مصیبتوں پر ان کے دلی رنج و غم کو ہو گا۔ ان کے نحیف و نزار دل کو کتنا ملال ہو گا کہ ان کی دونوں بچیاں جو کہیں کالے کوسوں دُور نکل گئی ہیں اپنی مصیبت میں انہیں پکار رہی ہیں لیکن وہ ان تک پہنچ نہیں سکتے۔ میں ان کا درد اپنے دِل میں محسوس کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم بھی ایسی ہی اُفتاد سے دوچار ہیں۔ لیکن اوّل تو ان کے پاس وہ ذہنی سہارے موجود نہیں جو مجھے میسّر ہیں۔ پھر ہم ایک دوسرے سے اتنے دُور بھی نہیں اور اس کے علاوہ آج کل کے اندھیرے سایوں سے پرے بقیہ زندگی کا روشن راستہ بھی ہماری نظر میں ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ مجھے بڑھاپے اور ضعیفی کے عالم میں کسی ایسے دُکھ کا سامنا کرنا پڑے جب آدمی صرف ماضی ہی پر نگاہ دوڑا سکتا ہے اور مستقبل کا سہارا باقی نہیں رہتا۔ بہر حال جن حالات کا مداوا اپنے بس میں نہ ہوں ان کی خاطر دل جلانا بے کار ہے، ہم اپنے بیچارے عمر دہ والدین کے لئے یہی کر سکتے کہ جس قدر محبت اور دلجوئی ممکن ہو سکے انہیں ہم پہنچائیں اور ان پر یہی ظاہر کریں کہ ہم زندگی سے اتنے زخم خوردہ نہیں ہیں جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور کسی نہ کسی دن ستارے موافق ہو ہی جائیں گے تو بات وہیں پہنچتی ہے جہاں سے چلی تھی یعنی یہ کہ ہم دوسروں کو رنج و خوشی برداشت کرنے میں جبھی امداد دے سکتے ہیں جب ہم اپنی ناخوشی کو قابو میں رکھیں کسی دوسرے کو خوش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی خود خوش نظر آئے یہ بعض اوقات مشکل تو ہوتا ہے لیکن کرنا ہی چاہیئے۔ "

"یہ لکھا ہی تھا کہ تمہارا خط آ گیا۔ یہ سال ختم ہونے کو ہے اور شاید ہماری آزمائش بھی۔ اس لئے دِل خوش رکھو اور براؤننگ کی نظم ربی بن عذرا یاد کرو۔

میرے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی منزل تک چلو
بہترین دن تو ابھی آگے آئیں گے

یہ سوال نہیں ہے کہ کونسی چیز کس چیز کے قابل ہے کیا شہرت اِس قابل ہے کہ اس کے لئے دِل لہو کیا جائے یا وصال اس قابل ہے کہ اس کے لئے فراق جھیلا جائے بات یہ ہے کہ اگر تن میں جان ہے اور آدمی اپنی دیانت اور خلوص باطن کے بھروسے پر سر اٹھا کر چل سکتا ہے تو زندگی میں جو بھی پیش آئے، رنج ہو یا راحت، ہر چیز اپنی اپنی جگہ اچھی ہے اور اس کا کسی اور چیز کا بدل ہونا ضروری نہیں یہ خط اس خیال سے لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ اگر اس ہفتے کے آخر میں تمہارا آنے کا ارادہ ہے تو چلنے سے پہلے تمہیں مل جائے۔"

"اب تک بُری خبر تمہیں پہنچ چکی ہوگی اس سے اپنا دِل زیادہ پریشان نہ ہونے دو۔ جیسے ہم نے پچھلے دو سال گزار لئے یہ بھی گزار لیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت اتنی بُری نہیں ہوتی جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں اتنے ہراساں کیوں تھے۔ ذرا سوچو تو اس نئی مصیبت کے آخر کیا معنی ہیں زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی مزید جُدائی۔ اگر تم گرد و پیش نگاہ دوڑاؤ تو ہندوستان پاکستان میں تمہیں شاید ہی کوئی نیک آدمی ایسا ملے گا جس نے برطانوی عہد میں اس سے زیادہ جیل نہ کاٹی ہو۔ اور کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ بدقسمتی سے نیکی اور نجات کی کوئی سہل راہ نہیں ہے، اس راہ میں ہم سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ کسی طرح غیر معمولی نہیں ہے۔"

"اور وہ شخص جو زندہ اور بیمار ہے لیکن اُسے صحتیاب ہونے کی اُمید ہے اُس شخص سے بہتر ہے جو زندہ اور بیمار ہے لیکن شفا سے نااُمید

اور یہ آخری شخص اُس شخص سے بہتر ہے جو کہ مر چکا ہے

اور جو مر چکا ہے وہ تو کوئی شخص ہی نہیں اس لئے وہ نہ کسی سے بہتر ہے اور نہ بدتر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی زندہ ہے وہ کسی نہ کسی سے بہتر ہے اس لئے اُسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اس سے مجھے گرمانی کا وہ قصّہ یاد آگیا جس میں "دو صورتیں ہیں" کی تکرار ہے اور پھر مجھے ہنسی آگئی۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ بہت وزنی اور سنجیدہ معاملات کے بارے میں ہمارا رویّہ قطعی غیر سنجیدہ ہے، تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ہے ہی اس قدر واہیات۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ تمہارے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے اور تمہارے تھکے ہوئے کاندھوں پر لمبے عرصے کے لئے مزید بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ لیکن اپنا دل مضبوط رکھو اور اُن لوگوں کے بارے میں سوچو جو تم سے کہیں زیادہ کم نصیب ہیں۔ یہ امتحان کیسا ہی سخت کیوں نہ ہو آخر گزر جائے گا۔ تم اس کا سوچو کہ جس دن یہ ختم ہوگا وہ دن کیسا عمدہ ہوگا۔"

"نہ جانے تم اس نئی افتاد سے کیسے نپٹ رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ہنگامی ردِعمل کے بعد ویران اور تنہا دنوں کے طویل سلسلے کے خیال سے اپنا دل ضرور پژمردہ ہوگا لیکن ابھی تک ایسا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اس کے خلاف جو بھی دن گزرتا ہے اپنا ذہن کچھ زیادہ باآرام، متوازن اور پُرسکون معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مستقبل کے بارے میں کوئی بے یقینی باقی نہیں رہی۔ منزل مقرر ہو چکی ہے اس لئے ہر بیتے ہوئے دن سے فاصلہ ایک قدم کم رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور سے پرسوں ایک ہفتہ پورا ہو جائے گا (سزا کی میعاد کا ایک ہفتہ) اور تین ہفتے کے بعد ایک مہینہ گزر چکا ہوگا۔ میں نے اس کا حساب یوں لگایا ہے کہ اگر کوئی رعایت نہ بھی ہو اور پوری میعاد (قید بامشقت میں عام طور سے ہر سال مشقت کے عوض چند ہفتے معاف کر دیئے جاتے ہیں، جیل کے سالانہ معائنے پر بھی کچھ رعایت ملتی ہے) کاٹنی پڑے تو بھی تیس مہینے بنتے ہیں یعنی ایک سو بیس ہفتے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرسوں صرف

ایک سو تیس ہفتے باقی رہ جائیں گے لوَدیات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اپنے لئے اپنا کام تجویز کر رکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اس مختصر عرصے میں اسے پورا کیسے کریں گے تم یہ سمجھ لو کہ ہم ہیبیٹ کی طرح ایف آر سی ایس کرنے چلے گئے ہیں یا کسی اور دوست کی طرح ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھ رہے ہیں۔ یہ کام ختم ہو چکے گا تو واپس آ جائیں گے۔ صرف ندامت اس بات پر ہے کہ ہم یہاں آرام سے بیکار بیٹھے ہیں اور تم پر اپنی اور بچوں کے لئے روزی حاصل کرنے کی ذمہ داری ہے جو مردوں کا کام ہے اور اچھے مرد یہ کام عورتوں پر نہیں چھوڑا کرتے۔ یہ خیال آتا ہے تو ندامت سے پسینہ آ جاتا ہے لیکن کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

"جیسے میں نے لکھا تھا میں نے تو نئے حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کر لیا ہے۔ صرف تم لوگوں کی خیر و عافیت کے بارے میں کبھی دل کو پریشانی ہوتی ہے لیکن تمہاری ہمّت اور بہادری کا سوچ کر اپنے دل کو تسلّی دے لیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس بہادری سے جسم و جاں پر کیا گزرتی ہے۔ ایسے حالات میں درد دل کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہئے اور اپنے غم کے سامنے سر جھکانے پر نادم نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ تحمّل اور برداشت کے پل صراط پر قدم میں کوئی لغزش نہیں آنی چاہیئے اور دنیا والوں کے سامنے سر نہیں جھکنا چاہیئے۔"

"دیکھو دو ہفتے گزر بھی گئے (اب صرف ایک سو اٹھارہ باقی ہیں) اور دن بہت تیزی سے نہ سہی لیکن پھر بھی مستقل اور بدستور گزرتے جا رہے ہیں۔ تمہیں شاید کوہ پیماؤں کا قاعدہ معلوم ہو۔ وہ یہ ہے کہ اگر چڑھائی سخت اور طویل ہو تو صرف اگلے قدم کو دیکھنا چاہیئے اور جس چوٹی تک پہنچنا ہے اُدھر نگاہ نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ جب تک وہاں پہنچ نہ جائیں وہ ہمیشہ اتنی دور دکھائی دے گی کہ حوصلہ ہار دینے کو جی چاہے گا۔ صرف ایک قدم اور اس کے بعد اگلے قدم پر توجہ ملحوظ رکھو تو پتہ ہوگا کہ فاصلہ اتنی جلد ٹ گیا۔ اس یکسوئی کی وجہ سے خوف اور بد دلی سے بھی نجات ہو جاتی ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ اس دوران میں عمر اور وقت اپنی جوانی اور شکل و

صورت پر جو غضب ڈھائیں گے اس کا صلہ کیا ہے۔ ایک بڑی حقیقت جو میں نے یہاں دریافت کی ہے یہ ہے کہ اپنی عمر اور شکل و صورت صرف اجنبی اور بیگانہ لوگوں کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اور جس عمر میں بیگانے ادھر توجہ دینے لگتے ہیں اُس عمر میں آپ بیگانوں سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں جیسے جیسے اجنبی دُنیا سے تعلقات کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اپنی نجی دنیا کے رشتے زیادہ گہرے، زیادہ مکمل اور زیادہ آسودہ ہوتے ہی جاتے ہیں۔ جس طرح ہر روز سماجی دُنیا بتدریج زیادہ بیگانہ ہوتی جاتی ہے اُسی انداز سے ہر روز اپنے عزیز عزیز تر ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محبت اور دوستی کا صرف یہی ایک سرمایہ اپنے پاس رہ جاتا ہے اور جذباتی آسودگی کے لئے اُسی خزینے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کے نظام میں جوانی کی دولت سے محرومی کا صلہ یہی ہے کہ بیتے ہوئے دنوں سے جو کچھ ورثے میں ملتا ہے اس کا شعور اور اُس کی قدر پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب براؤننگ نے لکھا تھا کہ بڑھاپے تک میرے ساتھ چلو۔ تو یقیناً ذاتی تعلقات کی یہی گہرائی اور استواری اُس کے ذہن میں ہو گی جو صرف عمر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے مجھے تو اب یہ گمان ہونے لگا ہے کہ صحیح محبت اور دوستی سن رسیدہ ہونے سے پہلے ممکن ہی نہیں۔ یہ رشتے اُن ہی لوگوں کے مابین ممکن ہیں جو جوانی کے لہو و لعب کو پیچھے چھوڑ چکے ہوں جب طرح طرح کے دلکش جھلاوے دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ جوانی کی عاشقی تو سرمایا ہے، سب فریبِ نظر ہے اگرچہ ہر فریبِ نظر حسین بھی ہوتا ہے اس لئے قابلِ قدر بھی۔ شاید تمہیں ہماری عقل و حکمت پر ہنسی آ رہی ہو گی اس لئے بس کرتے ہیں۔“

”______ میں بہار کے نام ایک سلام لکھنا چاہتا ہوں اور زندگی اور اُمید اور محبت کے نام بھی جن کا ہر بار نیا جنم لینا ایسا ہی ابدی عمل ہے جیسا کہ خزاں کی غارت گری۔ ان دلوں کے نام بھی جو غم سے دُھل کر مصفّا ہو جاتے ہیں اور ہر نئی کلی کے نام بھی جو بے دھڑک فنا اور نیستی کو للکارتی ہے۔ جی چاہا تھا کہ کراچی کے طلبہ کے لئے بھی کچھ لکھوں، لیکن اِس خیال سے نہیں لکھا کہ شاید میں اُن سے پورا انصاف نہ کر سکوں۔

یوں بھی ایسی نظم میں اُسی موضوع کی تکرار ہوگی جو میں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں یہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے بچوں کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں۔ شاید بعد میں کبھی کسی اور موقع پر انہیں خراج ادا کر سکوں گا۔ اصل میں اَب اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ اعتماد پیدا ہو جائے تو ارادہ ہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دَور کی عظیم الشان کشمکشِ حیات کا بیان ہو سکے اس لئے کہ ہمارا دَور شاید تاریخ کا سب سے شجاعانہ اور ولولہ انگیز دَور ہے۔ نہ جانے یہ کبھی لکھا جا سکے گا کہ نہیں۔ لیکن ارادہ ضرور ہے۔ "

" ایک اور ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور یہاں ہوا کے بوجھل پن میں اُور دھوپ کی تیزی میں موسمِ گرما کی تاثیر پیدا ہو چلی ہے۔ گرما کو انگریزی میں SUMMER کہتے ہیں اور بہار کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن ہماری گرمیوں کو بہار کا موسم کہنا بالکل مضحکہ خیز بات ہے اور اس موسم کے خاتمے کو خزاں کہنا بھی بے تُکا پن ہے۔ اصل میں بہار اور خزاں تو جذباتی اور رمزیہ الفاظ ہیں جن کا گرمی سردی سے بہت کم تعلق ہے۔ ان کا مفہوم تو ہے ستمِ روزگار اور اُس سے نجات، درد و غم کی ابتدا اور اُس کا خاتمہ، دل جلانے کے دن اور پیار کرنے کے دن، سختی برداشت کرنے کا عزم اور سکھ کا سانس، آسائش، خوشحالی اور افلاس و محرومی۔ ہمارے ہاں تو بہار کا ایسا کوئی موسم نہیں آتا۔ صرف گرمی سردی کا موسم آتا ہے۔ پھر مختلف لوگوں کے لئے موسمِ گرما کا پیغام بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ موسم قریب آئے گا تو تم اس کی آمد پر ہراساں ہوگی، لیکن میں اس کا خوشنودیٔ خاطر سے انتظار کر رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں موسم کی ہر تبدیلی خوش آئند ہوتی ہے کبھی کبھار کسی عزیز چہرے کے دیدار کے سوا یہاں کی زندگی میں یہی واحد تبدیلی ہے جسے ہم جانتے ہیں اس کے علاوہ موسم تبدیل ہوتا ہے تو اور بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ زمین اور آسمان اور پیڑوں کی رنگت بدل جاتی ہے، رات کو سونے کی جگہ، پڑھنے، گپ کرنے اور سونے جاگنے کے اوقات، زندگی کا روزمرہ معمول اور سوچ اور احساس کا پیرایہ سب کچھ بدل

جاتاہے۔ اور اگر کسبِ لطف اور حیرتِ نگاہ کی حس باقی ہو تو یہ سب کچھ بہت عجیب اور بہت اچھا لگتا ہے، دل کو فرحت ہوتی ہے۔

جیل خانے میں آدمی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے۔ میں ان لذّتوں کا ذکر کیے جا رہا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تنہا محنت کش عورتوں کے لئے اور ہم جیسے تنگ دستوں کے بچّوں کے لئے اس موسم کے کیا معنی ہیں اور اُن لوگوں کے لئے کیا معنی ہیں جو ہم سے بھی زیادہ تنہا اور محتاج ہیں؟ اپنی مصیبت میں اُن کی مصیبت بھی شامل ہے۔ اپنی تنہائی کے ساتھ اُن کی تنہائی بھی لگی رہتی ہے اور دنیا بھر کی دُکھی ماؤں کا دُکھ اور سب فرقت زدہ بیویوں اور محبوباؤں کا درد اور سب بچوں کے آنسو جنہیں ظالم ہاتھ اُن کے اپنوں کے پاس جانے سے روکتے ہیں لیکن اُن کے درد کے ساتھ اُن کی ہمت اور اُن کا تحمّل بھی اپنے ساتھ لگا رہتا ہے، یہ ایک دوسرے کی تلافی کرتے رہتے ہیں اس لئے دل ٹھوکر نہیں کھاتا۔

تم اس بات سے رنجیدہ ہو کہ کسی نے تمہیں لارڈ کلایو اور وارن ہیسٹنگز کے جرائم کا طعنہ دیا۔ یہ واقعی بہت تکلیف دہ اور دل دُکھانے والی بات ہے لیکن قومی منافرت کا خاصہ ہے کہ وہ ہر شے پر محیط ہوتی ہے اور کوئی بھی شکار ہاتھ آجائے خواہ وہ کیسا ہی معصوم اور بے گناہ کیوں نہ ہو، اُسے ایذا پہنچانے سے نہیں چوکتی۔ اسی لئے ایسی منافرت اور تعصبات سے جنگ و پیکار ضروری ہے۔ اسی سبب سے ہم نفرت اور تنگ نظری کے خلاف انسان دوستی اور اخوت کی عالمگیر جدوجہد میں شامل ہیں۔ جہاں تک طعنہ زنی اور تہمت تراشی کا سوال ہے میرے اپنے ہم وطنوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو گزشتہ واقعات کے بعد مجھے بھی ایک خونخوار طالع آزما سمجھتے ہوں گے۔ ایسے الزامات پر مجھے اکثر ہنسی آتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں اُن کی نظر میں یہ تہمتیں بالکل بے معنی ہیں اور جو ناواقف ہیں ان کی رائے بالکل بے وقعت ہے۔ یہی بات تمہارے بارے میں بھی صحیح ہے "جو لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں" اُن کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو حضرت مسیح کا تھا۔ صرف اخلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ عملی مصلحت کی خاطر۔ یوں نہ کرو تو

اپنا سکون و اطمینان اُنہی بُہتان طرازوں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے اور دُنیا میں ایسے افراد کبھی کم نہیں ہوتے۔"

"آج ایک اچھا جملہ پڑھا تھا کوئی ماں آسانی سے اپنا بچہ کسی کے حوالے نہیں کرتی اور ہم میں سے ہر کوئی ایک بچہ اپنے دل میں لئے پھرتا ہے۔ یہ بچہ مستقبل ہے صرف اپنا ہی نہیں ساری دُنیا کا مستقبل۔"

"۔۔۔ تم چاہو تو خواتین کے بارے میں اپنی فلسفیانہ بحث پھر سے شروع کریں۔ تم کہتی ہو کہ ہمارے فلسفے میں یہ نقص ہے کہ کج فہم لوگ اسے اپنے مقصد کے لئے مسخ کر لیتے ہیں جس سے بدمزگی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر یہ لوگ ہر بات میں معقول اور نارمل ہوتا تو کج فہمی یا کج روی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے انہیں سمجھانے بجھانے یا اُن کی کسی طرح دستگیری کرنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یوں نہیں ہے تو کیا انھیں بالکل ان کے حال پہ چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ اگر جہنم میں جاتے ہیں تو جائیں؟۔ مجھے تم سے اتفاق ہے کہ اپنے ذاتی آرام اور سکونِ قلب کی خاطر یہی بہتر ہے اور بیشتر دانشمند لوگ یہی کرتے ہیں لیکن ایک چھوٹی سی اقلیت اُن خدائی فوجدار قسم کے لوگوں کی بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس صورتِ حال میں انھیں ضرور مداخلت کرنی چاہیئے۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح کسی کی بہتری ہو جائے یہ خیال عام طور سے غلط ثابت ہوتا ہے، تو پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟۔ میں اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بہت ہی کم انسان ایسے ہوتے ہیں جو فطری اور بنیادی طور سے بد ہوں (میں افراد کا ذکر کر رہا ہوں اداروں یا جماعتوں کا نہیں) اور بیشتر لوگوں کی فطرت میں مختلف تناسب سے نیکی اور بدی دونوں شامل ہوتی ہیں۔ ابتدائے عمر میں اس امتزاج کی صورت بدلتی رہتی ہے لیکن بعد میں دھیرے دھیرے یہ ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ تب اسے بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب بھی اسے کچھ زیر و زبر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ عارضی طور ہی سے سہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے یا کڑکنے گرجنے سے یہ کام نہیں ہو

سکتا البتہ محبت اور دوستی کچھ موثر ہو سکتی ہے کیا اس سے دوسرے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے؟ عام طور سے نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھار یا بدو شاید ہوتا بھی ہے۔ بہر صورت اس کام میں ہاتھ ڈالنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ شاید اپنی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود پسندی کی وجہ سے اور حماقت بھی کہتی ہے کہ شاید تم اس قابل ہو کہ کسی کا بھلا کر سکو خواہ جواب میں تمہیں برائی ہی کیوں نہ ملے اور اگر کوئی یہ جتلانے کی کوشش کرے کہ یہ محض حماقت ہے تو ضد میں آ کر آدمی اپنی بات پر اور بھی ڈٹ جاتا ہے اور یہ بھی خود پسندی کی ایک صورت ہے غالباً تم سمجھتی ہو گی کہ یہ سب خرافات ہے جو کہ غالباً ہے اس لئے بحث بند۔"

"______________________________ ۔ہمارا جیل خانہ تو کسی اور دنیا کا ایک گوشہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں نہ حادثات زمانہ کا گزر ہے اور نہ زندگی کے خطرات کی آزمائش۔ یہاں نہ زندگی کا وجود ہے نہ موت کا اور جیتے جاگتے انسان جو ہنستے ہیں روتے ہیں پیار کرتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے ہیں سب کسی گرانڈیل افسانوی کتاب کے کردار معلوم ہوتے ہیں جو ابھی تصنیف بھی نہیں ہوئی۔ یہ محسوس کرنے کے لئے کہ ہم بھی زندہ ہیں اور ہم بھی زندوں کی برادری میں اور ان کے دکھ درد میں شامل ہیں تخیل پہ کافی زور دینا پڑتا ہے۔ لیکن شاید یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے جیل خانے میں کوئی بھی بات پوری طرح صحیح نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ اس طویل اور بے رنگ شب و روز میں جہاں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی اور موت سے پرے کسی غیر ملوی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں وہیں یکایک ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب زندگی سے اپنی یگانگت اور وحدت وجود کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے۔ محبت اور روشنی اور مسکراہٹ کی تلاش بھی لاکھوں کروڑوں، ان گنت انسانی جسموں کے درد و شجاعت، عالی ظرفی اور کلفت و آلام سے یک جان ہونے کا احساس۔ اور پھر وہ لمحے آتے ہیں جب غلیظ، زرد دیواروں دھول اور مٹی، زنجیروں، چہروں، وردیوں اور ان سب بعض چیزوں پر نظر پڑتی ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں تو یکایک کلیجہ

مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ موج در موج کراہت اور بیزاری کا سیلاب اندر سے اُٹھتا ہے جس میں اپنی ذات اور باقی ہر چیز غرق ہو جاتی ہے۔ پھر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج سیاہ بوجھل مٹی کو بہت سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین سے برآمد کرتا ہے اور اُسے دیکھ کر دل بے پناہ اور ناقابلِ بیان مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور تمام وقت دل جانتا ہے کہ اسی سبز کونپل کے ننھے ہاتھوں میں حقیقت بھی ہے اور ابدیت بھی۔ جیل کی دیواریں اور پہریدار اور وردیاں سب جھوٹ ہیں سب غیر حقیقی ہیں۔ اسی صورت سے دل یہ بھی جانتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک لحد میں سو جانے کے بعد بھی جینے والوں کی ملکیت اور ان کے رنج و راحت میں دخیل رہتا ہے۔ جیل میں محرومیاں بہت ہیں۔ لیکن جینے اور ہنسنے اور پیار کرنے کے اسباب میں یہاں بھی کمی نہیں ہوتی۔"

—— تم نے پوچھا تھا کہ ایک نیا لباس خریدنے کے بعد تمہیں کچھ گناہ کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُس کا فرائڈ کے نظریے سے کوئی تعلق ہے۔ میری رائے میں یہ احساس اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کہیں دیکھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم ایامِ غم میں سوگ منانے کے بجائے خوشی منا رہے ہیں اور ہمیں بے حس یا سنگدل نہ تصور کریں۔ لیکن یوں سوچنا بالکل احمقانہ بات ہے اس لئے کہ غم اور تکلیف ہی کا زمانہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب خوش دلی اور آسائش سب سے زیادہ درکار ہوتی ہے اور دل کی ڈھارس باندھنے کے لئے ظاہری شکل و صورت کے بناؤ سنگھار سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ جیل میں ہم جو فیشن پریڈ کرتے رہتے ہیں اس کا راز یہی ہے۔ جسمانی راحت کے علاوہ اس سے حوصلہ بھی بلند رہتا ہے جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے شاید میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ روحانی آسائش کے لئے نہ صرف اسے بھی کبھی کبھی نظر انداز کر دینا چاہیے بلکہ اس پر کھُلم کھُلا لعنت بھیجنی چاہیے۔ ——"

"یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ تم اور تم جیسے لاکھوں کے لئے روزمرہ زندگی کی اس رَتی پر قدم

جمائے رکھنا کتنا مشکل ہوگا جو دِن بدن باریک اور زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اپنا توازن قائم رکھنا تو اس لئے لازمی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کبھی کسی دن اُس رسّی سے اُتر کر ہم بھی کسی سبزہ زار پر آرام کریں گے اور پھولوں کو کھلتے ہوئے اور بچوں کو گاتے ہوئے دیکھیں گے۔ محنت اور سختی اور دُکھ تو جب بھی ہوگا لیکن اس کے مقابل محبت اور زندگی کی آسودگی اور بار آوری بھی ہوگی۔"

"جیسے تم نے کہا ہے اس بات سے بہت ڈھارس ہوتی ہے کہ نیکی اور دوستی کا وجود فنا نہیں ہوا اور دُنیا سب ظلم و ستم کے باوجود دَرصل مشفق اور مہربان ہے کیونکہ اُس کی اکثریت ہمارے تمہارے جیسے حقیر غم زدہ لوگوں پر مشتمل ہے جو بدی سے نفرت کرتے ہیں اور جو تھوڑا بہت اِن کے پاس ہو اُسے اپنے سے زیادہ کم نصیبوں کو راحت پہنچانے کیلئے قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً اگلے ہی دن کوئی بچی بہت بڑھیا مٹھائیوں کا ایک بڑا سا بکس میرے لئے چھوڑ گئی۔ دریافت کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی مس صاحب چھوڑ گئی ہیں اس لئے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کس کا شکریہ ادا کروں۔ شاید تمہاری نئی سہیلیوں میں سے کوئی ہو۔ بہر حال یہ خیال جسے بھی آیا شیرینی سے زیادہ شیریں تھا۔"

تم نے جس زور شور سے اپنے ڈانٹ ڈپٹ والے فلسفے کی حمایت کی ہے اُس سے بہت لطف آیا۔ میں جانتا ہوں کہ دُنیا کا کاروبار اِسی فلسفے کی بنیاد پر چلتا ہے اسلئے اس کی تحقیر کیسے کر سکتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی طرف سے پہلا پتھر نہ پھینک مارنے کا میرا جو فلسفہ ہے وہ تمہارے فلسفے کے مقابلے میں نسبتاً غیر اہم ہے اور اس فلسفے سے صرف شاعری پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ بڑھیا شاعری ہو۔ لیکن ڈانٹ ڈپٹ کے فلسفے کی پیروی میں بعض اوقات پیچیدہ مسائل کو سادہ بنا کر یک طرفہ فیصلے کئے جاتے ہیں جس سے مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ جیسے میرے فلسفے کی پیروی میں

سادہ مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اُس سے بھی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اختلاف کے باوجود تمہارے فلسفے کا احترام کرتا ہوں لیکن تم میرے فلسفے پر کام کرنے کو قطعی تیار نہیں ہو۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے ورنہ تمہارے فلسفے کی نفی ہو جائے گی۔ لیکن ہم دونوں مجبور ہیں۔ میں گُم کردہ راہوں، بداعمالوں اور مجرموں کی امداد کرنے پر ویسے ہی مجبور ہوں جیسے تم انہیں ناپسند کرنے پر مجبور ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان دونوں کے فلسفوں کے امتزاج سے کوئی جارحانہ انسان دوستی کا نظریہ تشکیل دیا جائے لیکن یہ تو ہمارے آنے کے بعد ہی ہو گا۔ جب تک ہم دونوں اپنی اپنی پسند اور ناپسند پر قائم رہیں۔"

"خیر مذاق ایک طرف، اگر سنجیدگی سے بات کریں تو تم یہ موضوع جاری رکھو، کوئی چھوٹا موٹا اسکینڈل نہ صرف زندگی میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے بلکہ دل بہلانے کے لیے موضوعِ گفتگو بھی مہیا کرتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی بدمزگی کا مضمون نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایسی باتوں پر زیادہ توجہ دینا بےکار ہے، کم از کم میں تو نہیں دیتا۔"

"جیل خانے میں ذہنی کیفیات کے جو مختلف دور گزرتے ہیں ان کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں ان میں سب سے زیادہ ضدی کیفیت وہ ہے جسے طبی زبان میں PRISON-COMA کہا جاتا ہے۔ ایک طرح کی خمار آلود نیم بیداری۔ جب ہر چیز کہیں دور چلی جاتی ہے، اور سب کچھ غیر اہم اور بے وقعت نظر آتا ہے، جب کوئی درد باقی رہتا ہے اور نہ کوئی راحت اور حرکت بریں بے آباد معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے جیسے اور سب کچھ گزر جاتا ہے۔ لیکن جب تک طاری رہتی ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو گی اور روح کسی ایسے کیڑے کی طرح بن جاتا ہے جو زیر زمین بے سُدھ پڑا ہو۔"

آج کل چاند نکلتا ہے، گداز اور بادلوں سے اداس اداس اور راتیں ایسی حسین ہیں جیسے کوئی درد۔ جب شام ڈھلتی ہے تو میں اپنے عقبی دروازے کے باہر جا بیٹھتا ہوں یا جا کھڑا ہوتا ہوں۔ سامنے ہسپتال کا سبزہ زار ہے اور پرے سڑک کا کچھ حصہ نظر آتا ہے جو ڈرگ روڈ کو جاتی ہے۔ مہاجروں کی جھگیوں کا ایک جھنڈ ہے اور ایک نارنجی رنگ کے ٹیلے پر میرے سامنے ایک چھوٹا سا مینار سے جو غالباً پانی یا گیس کی ٹنکی ہے جس کے دندانے دار ہیلو میں ایک رہبہ بلب جلتا رہتا ہے۔ اس سے ذرا اونچائی پر ایک اور تیز روشنی ایک تناور درخت کے سبز سینے کو منور کرتی ہے اور اس سے آگے کے موڑ پر ایک اور روشنی سے سڑک پر نور کا ایک تالاب سا نظر آتا ہے جس میں کبھی کبھار کسی دوڑتی ہوئی کار اور کبھی کسی سست رو رہگیر کی جھلک لمحہ بھر کے لیے ابھرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ سر پر بادل پیچ و خم کھاتے رہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہر حرکت کے ساتھ رات کا موڈ بدل جاتا ہے۔ رات کا چہرہ کبھی روشن مسکراہٹ سے کھل اٹھتا ہے اور کبھی ابدی افسردگی سے دھندلا جاتا ہے اور میں یہ نظارہ کرتا رہتا ہوں۔ کبھی رات کی معیت میں کبھی اکیلے رات سے الگ۔ اور اس میں بہت تسکین ہے اور بہت درد ہے اور دل دونوں کے لیے احسان مند محسوس کرتا ہے درد کے لیے بھی تسکین کے لیے بھی۔ اس لیے کہ دونوں گواہی دیتے ہیں کہ حالات کے موذی روگ کے باوجود دل زندگی سے بہرہ ور ہے اور اس روگ کے باوجود زندگی خوب اور صحت مند ہے۔"

"________ تم نے پوچھا ہے کہ دوسروں کی زندگی میں دخل دینا چاہیے کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں ضرور دینا چاہیے بشرطیکہ آدمی دیانت داری سے محسوس کرے کہ اس سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر نیک نتیجہ برآمد ہو تو شکریے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہیے اور نتیجہ برعکس ہو تو سب الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میرے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے لیکن مجھے اس کا ذرا بھی تاسف نہیں۔ اس کھیل میں ایسے

ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آدمی یہ کھیل کھیلنے پر مجبور نہیں لیکن یوں دیکھئے تو آدمی اپنے سوا کسی کے لیے کچھ بھی کرنے پر مجبور نہیں اور اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔"

"آج صبح جب میں ناشتہ کرنے بیٹھا تو یکایک بدر کی یاد آئی اور دل تلملا اُٹھا، میں بہت دیر تک کچھ افسردگی سے سوچتا رہا کہ انسانی دوستی کیسی فانی اور بے حقیقت شے ہے اور انسان کا دل کتنا ناشکرا ہے۔ بدر غالباً ہمارا واحد مخلص دوست تھا لیکن ہم نہ کبھی اس کے گھر گئے ہیں نہ کبھی اس کی بیوی بچوں کی خبر لی ہے، یوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ایسے ہی ہونا چاہیے مرنے والے کیسے بھی عزیز کیوں نہ ہوں بہرحال زندگی سے لاتعلق ہیں اس لیے انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ صحیح ہے۔

جو مرنے والے یاد میں زندہ ہوں کیا وہ جینے والوں کی زندگی ہی کا جزو نہیں ہوتے اس لیے کہ یاد ایسی ہی حقیقی شے ہے جیسے کوئی دردِ ذہنی تجربہ یا واقعی ملاقات، پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ مرنے والوں کی نیکی جینے والوں کی یادداشت میں ایک مثبت اور موثر عنصر کے طور سے زندہ رہے بشرطیکہ اس یاد سے جو درد وابستہ ہو اُسے کسی طور سے الگ کیا جا سکے یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ جو درد موت جیسی لاعلاج چیز سے وابستہ ہو وہ بے کار اور بے مقصد شے ہے اور بے مقصد دکھ اُٹھانا حوصلہ شکن بھی ہوتا ہے، غیر اخلاقی بھی۔ بہرحال کسی دن صوفی یا حسرت کو ساتھ لے کر بدر کے گھر والوں سے مل آنا۔"

"اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں، دن ڈھل رہا ہے اور چند ہی لمحوں میں دیوار اور درختوں پہ تانبے اور کانسی کے رنگ کی روشنی کی آخری کرن بجھ جائے گی۔ پھر پرندوں کی آوازیں گنگ ہو جائیں گی، اور وقت ٹھہر جائے گا، جس دن بیڈمنٹن کا کھیل نہ ہو یہ کافی برا وقت ہوتا

ہے، نہ اتنی روشنی موجود ہوتی ہے کہ باہر بیٹھ کر پڑھ سکیں۔ اتنا اندھیرا کہ بجلی روشن کر سکیں (ویسے یہ ہم کر بھی نہیں سکتے اس لیے کہ دن میں بجلی بند رہتی ہے اور شام میں کافی دیر سے کھلتی ہے) اس وقت اگر آنکھیں الفاظ شناخت بھی کر سکیں تو دماغ ان کے معنی وصول کرنے سے انکار کر دیتا ہے، اس وقت سوچ بچار کرنا بھی اچھا نہیں اس لیے کہ گزرے ہوئے دن کی خاموش جانکنی خیالات کو افسردگی میں رنگ دیتی ہے۔

ہمارے ہاں اس وقت کے تعلق سے جو تصورات وابستہ ہیں اب میں انہیں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمارے محاورے میں "دونوں وقت ملتے ہیں"۔ دن کی پراسرار گھڑی جب کنواریوں کو کھلے میں ننگے سر کھڑے ہونے سے منع کیا جاتا ہے، جب کوئی نیا کام شروع نہیں کیا جاتا، نہ کوئی مردہ دفنایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض لوگ تلاوت بھی نہیں کرتے، یہ عقائد تو اس زمانے سے چلے آرہے ہیں جب سورج ایک زندہ دیوتا مانا جاتا تھا اور اندھیرا ایک زندہ عفریت۔ اب یہ دیوتا اور عفریت تو مر مرا چکے لیکن جان بلب دن کی افسردگی اب بھی حقیقت ہے جو اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک رات اس کی موت کا یقین اور اگلی صبح کی پیدائش کی اُمید ساتھ لیے آ نہیں جھکتی ،،

"منٹو کی وفات کا سُن کر بہت دکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گزر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ ہمارے شرفا جنھیں دورِ حاضر کے فنکار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی

بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی۔ موزارٹ نے بھی۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرپیکار رہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصّہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصّہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمہارے راستے ہی میں ہے گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا دینا۔"

فیض کا فلسفۂ ادب

عموماً تحریک اور تنظیم کے امتیاز میں لوگ مغالطہ کرتے ہیں۔ جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے وہ ادیبوں میں آج بھی موجود ہے اور اس سلسلے میں رائٹرز گلڈ اور حلقۂ اربابِ ذوق وغیرہ کا نام بھی پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہمیں تحریک کی ضرورت ہے۔

تحریک کسی سیاسی مقصد کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ تنظیم سے حاصل ہو سکتی ہے تحریک تو جذباتی مسائل پر ایسے ردِ عمل کا نام ہے جو اجتماعی پہلو رکھتے ہوں۔ یہ ایک معاشرتی ضرورت اور پیداوار ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ ہر شخص معاشرے میں رہتا ہے اور ہر معاشرہ چند جذباتی مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ ان مسائل پر توانفرادی ردِ عمل ہوتا ہے اور ان کا حل انفرادی کوششوں سے نکالا جاتا ہے لیکن بلوغت اور شعور ان میں ایسے پہلو تلاش کر لیتا ہے جو بغیر متحدہ کوششوں کے پورے نہیں کئے جا سکتے، یہی وہ جذباتی مسائل ہیں جن کے اجتماعی صورت اختیار کرنے سے تحریک پھوٹتی ہے۔ یہ معاشرے کی حرکت اور ارتقاء کے لئے بھی ناگزیر اور لابدی ہے اس کے ساتھ ہی ادب اور تہذیب کے فروغ میں بھی MUST کا درجہ رکھتی ہے۔

معاشرے کے مسائل ایسے نہیں ہوتے جو انفرادی ہوں اور جن کا حل بھی انفرادی ہو یہ تمام مسائل معاشرتی ہونے کی بنا پر اپنی تشکیل سے ایک مشترکہ جدوجہد چاہتے ہیں

یہ درست ہے کہ جذباتی ردِعمل انفرادی ہوتا ہے لیکن یکجہتی اور اشتراک کے بغیر ان کا حل ممکن نہیں ہوتا۔ اس شعور سے تحریک کی بات چلتی ہے گویا مسائل کا شعور اور ان کے حل کا اجتماعی پہلو سمجھے بغیر ہر طرح کی جدوجہد تحریک نہیں کہی جا سکتی اور میں اسی بات کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں تنظیمیں تو موجود ہیں لیکن تحریک کا فقدان ہے۔

افراد معاشرتی مسائل پر بچگانہ ردِعمل کر رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایک بچے کی طرح وہ اپنی ضد اور مرضی سے تمام مسائل حل کر لیں گے۔ ادب ہو یا تہذیب انفرادی کوششوں سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خواہ ترقی پسند تحریک ہو یا ادب کی جمالیاتی تحریک اپنے فعال دور میں بڑی خدمت انجام دے چکی ہے۔

موجودہ صورتِ حال میں نوجوانوں کی تنظیمیں تو موجود ہیں اور وہ تحریک کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ نوجوان حقیقت کے بجائے عینیت سے کام لیتے ہیں اور ادب زندگی اور معاشرے کے مادی رشتوں پر پوری توجہ نہیں دیتے۔ انجام کار تحریک کی عدم موجودگی سے جذبات و فکر کے لئے نمو نہیں پاتے اور انفرادی طور پر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔

سیاست زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے کون سی ایسی بات یا کام ہے جو اپنا مقصد نہ رکھتا ہو اور جہاں بھی کسی مقصد کی بات آتی ہے وہ دورِ افکار میں سیاسی ہو جاتی ہے لہٰذا لفظ سیاست سے بچنا یا اسے چھوت سمجھنا ایسی حماقت ہے جس سے خود اپنے ہی نقصان کا احتمال ہے۔ رہا تحریک کا خالص سیاسی ہونا تو پھر وہ سیاسی تحریک ہو جائے گی اور ادبی تحریک کے لئے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسے ادبی تحریک ہی ہونا چاہیئے نہ سیاسی اور نہ غیر سیاسی یعنی سیاست سے فرار بھی نہ ہو اور سیاست میں ملوث بھی نہ ہو۔

تحریک سے مراد یہ ہے کہ لکھنے والے ایک اسلوب اور ایک رجحان کے تحت لکھیں یا یوں کہیئے کسی مکتبۂ خیال سے بھی ہراساں ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ کوئی ادیب یا فن کار کسی

آئیڈیل کے بغیر لکھ ہی نہیں سکتا۔ اب یہ آئیڈیل پر منحصر ہے کہ وہ کس مکتبہ خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیائے کوئی فرق نہیں ہوگا کیونکہ وہ تو ایک تنظیم کا احیا ہوگا اور میں یہاں تحریک پر زور دے رہا ہوں۔ تحریک تنظیم کی شرط سے آزاد ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک نام یا ایک ڈھب سے ہی تحریک شروع کی جائے تنظیم کی موجودگی سے اتنا ضرور ہے کہ مل بیٹھنے اور افہام و تفہیم کے لئے موقع ہاتھ آجاتا ہے اور اس طرح لکھنے والے کو لکھنے کی خواہش ہوتی ہے اپنے اور دوسرے کو تحریک کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی گنجائش رہتی ہے۔ یہی تنظیم کی ایک ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھیئے کہ تنظیم ایک مادی چیز ہے اس میں شمولیت کے یہ معنی نہیں کہ تحریک سے وابستگی ہو۔ مثلاً انجمن ترقی پسند مصنفین ہی کو لیجئے تنظیم میں متعدد حضرات شامل تھے اور ساتھ بھی رہے۔ لیکن ان سب کو تحریک کا نمائندہ سمجھنا غلط ہوگا۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ لوگ تحریک سے متاثر نہیں تھے۔ یہی حال حلقۂ ارباب ذوق کا ہے۔

غزل :۔

غزل پر یہی کیا موقوف ہے۔ ہر صنفِ سخن کی اپنی پابندیاں ہوتی ہیں۔ یہ بات تو بڑی حد تک درست ہے کہ غزل ہمارے بہت سے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی پھر بھی اس کے یہ معنی نہیں کہ غزل غیر ضروری ہے۔ غزل اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تخصیص رکھتی ہے جو دوسری اصناف کو میسر نہیں اور یہی غزل کو زندہ رکھنے والی بات ہے۔ وہ پابندیاں جو غزل پیش کرتی ہے انہیں سخت ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن انہیں مصرف میں لانا تو شاعر کی ذمہ داری ہے۔ قافیہ ردیف یا بحر کی پابندی اپنی جگہ جان لیوا ضرور ہے۔ لیکن یہ خیال کو جلا بھی دیتے ہیں نظم میں آزادی بھی زیادہ ہے اور براہِ راست بات کہنے کا موقع بھی ہے جب کہ غزل ان دونوں سہولتوں سے عاری ہے۔ پابندیوں کے باوجود غزل بہ اعتبار ہیئت نظر انداز کی جانے والی صنف نہیں ہے اور ہمارے ادب میں غزل کے سوا ہے بھی کیا؟ اگر بالواسطہ اظہار کیلئے

کوئی صنف موزوں ہو سکتی ہے۔ تو وہ غزل ہی ہے۔ اس فنی تعریف کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو غزل ایک مفید صنفِ سخن قرار پاتی ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ طرح کی پابندی پر شاعر کو مجبور کرنا شاعری کے حق میں مفید نہیں۔ شاعر کو زمین اختیار کرنے میں آزادی ملنا ہی چاہیئے تاکہ وہ اپنے جذبے کی صحیح نمائندگی کر سکے بلکہ غزل کی زمین اُس کے انتخاب کی بنا پر اظہار کے لئے معاون ہو سکے گی۔ ہاں مشاعرے میں طرحی مقابلے کوئی بڑی ادبی خدمت انجام نہیں دے سکتے، اور یہ ختم بھی ہو رہے ہیں۔ اس اعتراض کو غزل کی صنف پر عائد کرنا کچھ درست نہیں۔

علاقائی زبانیں، اُردو :۔

علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی پر اُردو داں حلقوں کا ہراساں ہونا کوئی مناسب بات نہیں۔ خود اُردو کے حق میں علاقائی زبان کی ترویج ایک مفید امر ہے لیکن شبہات کا کیا کیا جائے۔ یہ شبہات کچھ ایسے غلط بھی نہیں جن سے منافرت پھیلتی ہے۔ علاقائی زبانیں بولنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کو جبراً نافذ کیا گیا ہے۔ ادھر اُردو دانوں کا خیال یہ ہے کہ کہیں اُردو اپنا مقام نہ کھو دے۔ اسی لئے یہ زبانیں اب تک مانوس نہیں ہوئیں اور یہ عمل اُردو کے مفاد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ ہمیں جبر کے تصور کو ختم کرنا پڑے گا اور علاقائی زبانوں کا احترام اور ان کے مقام حاصل کرنے میں معاونت کرنی ہوگی یہ سیدھا سادا تعلیمی مسئلہ ہے۔ لیکن منافرت نے اسے ایسا رنگ دیا ہے جس سے اُردو پر زد پڑ رہی ہے۔ تعلیمی مسائل میں یہ طریقۂ فکر سرکار برطانیہ کی سامراجی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ برطانیہ نے اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے ایک خاص طریقۂ تعلیم مروّج کیا تھا۔ متعدد صوبوں میں تو اس نے صوبائی زبانوں کو تعلیم کے معاملے میں تسلیم کر لیا لیکن پنجابی کو اُردو کے مقابلے میں نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب میں فارسی زبان زیادہ مقبول تھی اور اُردو فارسی کا حق لے سکتی تھی انگریز فارسی یا کسی اور بدیسی زبان کو اپنا ذریعۂ اقتدار تو بنا ہی نہ سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں

نے مقامی زبانوں میں سے ہندوستانی کو منتخب کر لیا۔ جو محض رسم الخط کا اختلاف رکھتی تھی۔ جو انگریز افسر حاکم کی صورت میں آتے تھے وہ یہاں کی زبانوں میں اُردو ہی سے واقف ہوتے تھے۔ لہٰذا یوپی کے ساتھ انہوں نے پنجاب میں بھی اُردو کو ہی ذریعہ تعلیم رکھا اور خود پنجاب کے شہروں میں اُردو کی مقبولیت فارسی کے ذریعہ موجود ہی تھی لیکن دوسرے صوبوں کی زبانوں کے اُردو سے بنیادی اختلاف اور نا آشنائی نے انگریزوں سے مقامی زبانوں کی سرپرستی کرا لی اور فارسی کے مقام کو جو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی انگریزی سے پورا کیا۔ یہ سسٹم ایک حد تک تہذیبی اور قومی مفاد کے لئے مناسب ہے۔ اس پر اب ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ لہٰذا اگر پنجابی کو پانچویں درجے تک ذریعۂ تعلیم بنانے کا مطالبہ رکھا جاتا ہے تو اس پر بدکنے یا خطرہ دیکھنے کے بجائے افہام وتفہیم سے کام لینا چاہیئے۔

نئے لکھنے والے

نئے لکھنے والوں سے میں یہاں مشاعروں کے ذریعہ متعارف ہوا ہوں — انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ابھی سے ان کے مستقبل کی بابت حکم لگانا غلط ہوگا۔ اتنا فرق ضرور پڑا ہے کہ نوجوان جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو ان کی رہنمائی کے لئے کچھ ہونا ہی چاہیئے جس سے وہ متاثر ہو سکیں۔ ہمارے زمانے میں اور آج کے زمانے میں یہ بڑا فرق ہے کہ ہند و پاک کی تحریکات آزادی اپنے عروج پر تھیں نئے اور پرانے میں پیکار تھا۔ لیکن اس دور کے نوجوانوں کے لئے نئے اور پرانے وغیرہ کی تمیز ہی مشکل ہو گئی ہے چیزیں اس قدر رُوپ بدل چکی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں اور اس ماحول سے فن کار کا متاثر ہونا یقینی ہے پھر بھی میں نہیں سمجھتا کہ اس نتیجے میں ہم نا امید ہو جائیں۔ ایسے بحرانی دور میں ملک اور ثقافت دوچار ہوتی ہی آئی ہے۔

فنکار تنہا کھڑا ہے

ہاں اگر کوئی تحریک ہوتی تو اس میں تخلیقی جذبے کی تخلیق بھی ہو سکتی تھی اور تربیت بھی

ناپختگی کا ایک ہی سبب ہے کہ فنکار تنہا کھڑا ہے ہمارے عہد کے معاشرے میں اجتماعی جذبے موجود تھے۔ تحریک پیدا کرنے کا ذمہ دار فنکار کے عہد کا معاشرہ ہوتا ہے، ہمارے عہد کی تحریک نے اظہار کی صورت پیدا کر دی تھی۔ لوگوں میں جذبہ پہلے ہی موجود تھا اور آج بھی ہے۔ جذبہ تحریک سے جلا پاتا ہے۔ لہٰذا نئی نسل کو الزام دینا مناسب نہیں۔

ہمارے ہاں ایک ایسا طبقۂ فکر موجود ہے۔ جو خالص سیاسی مقاصد کے لیے فن، ہنر اور شعر و ادب کو اس لیے ملعون گردانتا ہے کہ ان ہی ذرائع سے لوگوں کے ذہن جلا پاتے ہیں اور وہ سنجیدہ غور و فکر کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس طبقۂ فکر کا مطمح نظر یہ ہے کہ ان کی بالادستی اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لوگوں کو ہمیشہ اندھیرے اور جہالت میں رکھا جائے اور ان کے ذہن روشنی کی کوئی شعاع چھونے نہ پائے۔

مولانا حالی کے زمانے میں ایک عنصر یہ بھی تھا کہ انگریز ہندی مسلمانوں کو ان کے علمی ادبی اور ثقافتی ورثے سے بدظن کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے منظم طور سے یہ تبلیغ کی کہ تمہارے شعر و ادب میں خرافات کے علاوہ کچھ نہیں رکھا ہے اگر تمہیں علم سیکھنا ہے تو ہماری پیروی کرو اور ہمارے ادبی نظریات اور اقدار کو اپناؤ۔ اس میں اس حد تک صداقت بھی تھی کہ مسلمانوں نے عباسیوں کے بعد شعر و ادب اور فنون میں تو بڑا کمال حاصل کیا مگر سائنسی علوم سے منہ پھیر لیا۔ مشرق میں سائنسی علوم کا جو نکتۂ زوال تھا وہیں سے یورپ میں علوم و سائنس کے احیاء کا دور شروع ہوا۔ یہی دور برصغیر میں سلطنتِ مغلیہ کے آغاز کا دور ہے مغلوں کی بھی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ انہوں نے اس جانب کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ اگر تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے دیکھا جائے تو مغلیہ دور مغرب سے کہیں زیادہ ترقی پذیر تھا۔ جب حکومت کو زوال ہوا تو اس کی کوتاہی کی ذمہ داری شاعروں اور فن کاروں پر ڈال دی گئی شعر و ادب کے خلاف تعصب کچھ تو انگریزوں کا پیدا کردہ تھا اور کچھ اس وجہ سے تھا کہ بعض سادہ لوح لوگ انگریزوں کے ان ہتھکنڈوں سے متاثر ہو گئے۔

شاعر اور ادیب اجتماعی حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی کرتا ہے بڑے شاعر صحیح تجزیہ کر کے معاشرے کی رہنمائی کرتے ہیں۔ چھوٹے شاعر یا ادیب یا فنکار اس انحطاط کی لپیٹ میں آ کر اسے اور بڑھا دیتے ہیں۔ چونکہ بڑے شاعر خال خال پیدا ہوتے ہیں اور گھٹیا شاعروں کے غول کے غول پیدا ہوتے ہیں اس لئے کم سمجھ لوگ اچھی شاعری کو شعر کا نمونہ سمجھنے کے بجائے اس گھٹیا شاعر سے شاعری کا اندازہ لگاتے ہیں اور شاعر، بھانڈ، مراسی اور جملہ ارباب نشاط کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اسی سبب سے بڑے شاعر بھی شاعر کہلانے کو عار سمجھتے ہیں اور ان کے مداح انہیں مفکر، حکیم، فلسفی وغیرہ کہنا پسند کرتے ہیں۔

فیض: نظریئے کی جو اصطلاح ہے اس کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں نظریے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر ہمیشہ بہت باقاعدگی سے کسی فلسفے کا تفسیر یا سیاست کا یا کسی اور چیز کا کوئی منظم اور مربوط نظام پیش کرے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ یا کوئی بھی تجربہ کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز کو آپ کئی نقطہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا بڑا شاعر یا بڑا فن کار، ادیب، مصور، یا موسیقار یاد نہیں جن کے ذہن میں اپنے گرد و پیش کے متعلق کچھ تاثر، کچھ نہ کچھ احساس یا کوئی نہ کوئی نظریہ نہ ہو اور وہ کسی احساس اور تجربے پر منحصر نہ ہو، ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ یہ دنیا اچھی ہے یا بری، لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا بری طرح، ان کے لئے کچھ کرنا چاہیئے یا نہیں کرنا چاہیے یا انسانیت کس طرف جا رہی ہے یا کس طرف نہیں جا رہی ہے کوئی زیادہ حساس اور ذی شعور آدمی نہیں ہو سکتا۔ ہر فن کار اور ادیب کے لئے شعور لازمی ہے۔

فیض اور کلچر

میں نے ٹیلی ویژن پر جن امور کی وضاحت کی کوشش کی تھی وہ یہ ہیں. کلچر گانے بجانے یا لہو ولعب کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قومی اور معاشرتی زندگی کا بہت اہم شعبہ ہے کلچر معاشرتی زندگی کے جملہ کاروبار پر اثر انداز ہوتا ہے پورے طریقۂ زندگی کو کلچر کہتے ہیں جس میں سب کچھ شامل ہوتا ہے کلچر کی اثر اندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے، عقائد اور اقدار کے ذریعے بھی، عملی طور سے بھی، زندگی کے آداب و رسوم سے اور زندگی کے روزمرہ کا جو محاورہ ہے اس کے ذریعے بھی۔ اجتماعی زندگی کی ظاہری اور باطنی تفاصیل دونوں شامل ہوتی ہیں فنون، ادب، موسیقی، مصوری، فلم وغیرہ اسی کلچر یا WAY OF LIFE کے ارادی، ترشے ہوئے اور منجھے ہوئے اجزا ہوتے ہیں مگر ان دونوں کو یعنی کلچر اور فن کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے. فن کلچر کا ایک مظہر ہوتا ہے اور کلچر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں پورا طریقۂ زندگی ہے۔

معاشرے کا جو ڈھانچہ ہوگا، اس کی جیسی ہیئت ترکیبی ہوگی یا جیسا سوشل اسٹرکچر ہوگا کلچر تمام تر اس کے تابع ہوگا جیسے جیسے سیاسی یا معاشرتی حالات بدلتے ہیں اس کے مطابق کلچر کے تصورات اور اس کی اشکال بھی بدلتی رہتی ہیں یا بدلنی چاہییں. نہ کوئی جامد شے ہے، نہ اسے دوام حاصل ہے ازل سے آج تک صدیوں کی دوڑ میں کتنے ہی کلچر پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے یا ان میں ردو بدل ہوتا رہا ہے. اسی باعث میں نے کہا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا

ثبوت موجود ہے کہ کلچر کے تصور اور اشکال میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت ایک نوح کی تھی پاکستان بننے کے بعد اس میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی اور اسی کے مطابق ہمیں اپنے کلچر کا تصور قائم کرنا چاہیئے تھا جواب تک ہم نے نہیں کیا۔

برصغیر کی تقسیم سے ایک نیا ملک وجود میں آیا۔ پاکستان۔ ایک نئی قوم وجود میں آئی۔ پاکستانی قوم میں مختلف علاقے ہیں۔ اور ہر علاقے کی اپنی اپنی مخصوص زبان اور مخصوص رسوم و رواج ہیں جو نہ تو کسی فیکٹری کے تیار کردہ مال کی طرح ہیں اور نہ کسی حکومت کے بنائے ہوئے قاعدے قانون کا نتیجہ بلکہ تمام تر تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی پیداوار ہیں مختلف علاقوں کی جب بات ہو تو ہمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ان میں بہت سے بنیادی مشترک اجزاء ہیں جو ہمارے قومی کلچر کی اساس ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم عنصر اشتراک دین ہے اور دوسرا سبب یکساں تاریخی تجربات۔

ملک کے دو یا دو سے زیادہ علاقوں کی تہذیبوں میں جو فرق ہے اسے فرق سمجھنا چاہیئے تضاد نہیں۔ اور ان میں اشتراک و یگانگت کی جتنی ممکن صورتیں ہیں ان پر توجہ کرنی چاہیئے۔ اس لیے کہ قومی یک جہتی ان اختلافات یا تفریقات کی نفی کرنے سے وجود میں نہیں آسکتی بلکہ ان کے اقرار کے بعد تمام مماثلات کو یکجا کرنے سے ہی ممکن ہے دنیا میں کوئی ملک ایسا ہے نہ کبھی ایسا تھا جس میں اس ملک کے تمام علاقوں کی تہذیب بالکل یکساں تھی اور ان میں کبھی کوئی فرق یا اختلاف نہیں تھا۔ کیا انگلستان میں سکاٹ لینڈ اور ویلز کی تہذیبیں یکساں ہیں؟

اس اختلاف کے ذکر کو چار قومیتوں کا پرچار کہنا یا صوبائی تعصبات کا رنگ دینا قطعی غلط اور گمراہ کن ہے۔ یہ دراصل اصطلاحات کی بیکار سی جنگ ہے اور یہ اصطلاح ہم نے انگریزی زبان سے اپنی زبان میں منتقل کی ہے جس کی وجہ سے اس کے معنی و مفہوم میں

بہت سے مغالطے پیدا ہو رہے ہیں۔

انگریزی میں نیشنیلیٹی کا جو مفہوم ہے میرے خیال میں اردو کے "قومیت" کے مفہوم سے اس لئے مختلف ہے کہ ہماری زبان اور ہماری قوم کا مزاج بالکل الگ ہے اور اعتبار سے صحیح ترجمہ ہونے کے باوجود ہمارے معاشرے میں قابل قبول نہیں ہے اور اسی لئے اصطلاحات کی یہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔

پرانی تاریخوں میں ایک شخص کا نام ملتا ہے۔ ہیمو جس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ قوم کا "بقال" تھا۔ مضامین میں آپ کو لکھا ہوا ملے گا کہ فلاں شخص قوم کا بنیا تھا یقال اور بنیا تو کوئی قوم نہیں مگر اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محض ایک لفظ کسی غیر زبان کے لفظ کے ترجمے سے کتنی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ میں پھر ایک بار کہوں گا کہ یہ محض اصطلاح کی جنگ ہے جو قومی یک جہتی کو نقصان پہنچا رہی ہے۔

ٹیلی ویژن پر دوسری بات میں نے یہ کہی تھی کہ کلچر اور ریاست کے حدود عام طور سے یکساں نہیں ہوتے۔ وسط ایشیا میں کئی ممالک ہیں جو عرب و عجم کی تہذیب کے زیر اثر ہیں۔ یورپ کے کئی ممالک پر یونان و روما کی کلاسیکی تہذیب کا اثر ہے۔ یہی صورت پاکستان کی ہے۔ بلاشبہ ہمارے تہذیبی ورثے میں دہلی و آگرہ اور میر و غالب بھی شامل ہیں۔ اسی طرح سمرقند و بخارا اور حافظ، سعدی اور رومی بھی شامل ہیں لیکن تھوڑی سی تفریق بھی لازم ہے، ان تہذیبی مظاہر و آثار میں جو اس وقت ہماری سرزمین میں موجود ہیں اور ان مظاہر و آثار میں جو اس سرزمین کے باہر ہیں۔

شعر کی شانِ نزول

ہم ماسکو کے سفر سے جب بھی گھر لوٹتے ہیں تو عام طور سے دوستوں کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ کیوں جی وہاں پر کچھ ہوا؟ اور عام طور سے ہم شعر کی صورت میں کچھ نہ کچھ ساتھ لے ہی جاتے ہیں۔ لیکن کیوں؟ میں نے اس بارے میں پہلے تو کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اب جو لکھنے بیٹھا ہوں تو اس کی

ایک آدھ وجہ سمجھ میں آتی ہے شعر لکھنے پر طبیعت کیوں اور کیسے مائل ہوتی ہے، کیسی فضا کیسا ماحول، فکر سخن کے لئے زیادہ سازگار ہوتا ہے. اگلے وقتوں کے شاعر اس کا ایک ہی سیدھا سا جواب جانتے تھے یعنی :-

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

یا

نہ رہی بات وہ مضمون سمجھانے والی

لیکن یہ تو غالب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ "تصوّر جاناں" کے لئے فرصت کے رات دن بھی شرط ہیں اور شعر لکھنے کے لئے صرف جسم کی فرصت یعنی دوسرے کام کاج سے فراغت ہی کافی نہیں، دل و دماغ کی فرصت اور یکسوئی بھی ضروری ہے جب آدمی دل و دماغ کے باقی کھڑکیاں دروازے بند کر کے صرف فکر سخن کا ایک دریچہ کھلا رکھ سکے گھر میں تو یوں ہوتا ہے کہ ادھر کسی نظم کا کوئی ہیولی ذہن میں تلملانے لگا تو دفتر جانے کا وقت ہو گیا یا غزل کی کسی زمین کسی مصرع کا سر ہاتھ آیا تو ملنے والے آ گئے، وقت ٹل گیا تو اسی کیفیت کو واپس آنے میں کبھی دن کبھی مہینے لگ گئے اور کبھی طبیعت دوبارہ ادھر مائل ہی نہیں ہوئی، سوویت یونین میں یہ ہے کہ گردش دوراں اور کشمکش روزگار سے چند روزہ نجات میں اور مصروفیتوں کے باوجود فرصت اور یکسوئی کے ایسے چند لمحات آہی جاتے ہیں...... کبھی ماسکو میں کسی دوست کے گھر کی بالکونی پر بیٹھے ہوئے کبھی اشک آباد میں اپنے ہوٹل کی چھت پر، کبھی لینن ہلز سے شہر کو تکتے ہوئے ایسی کیفیت اکثر دل پر گذری ہے، یہاں کے لکھے ہوئے اشعار میں ماسکو کا ذکر تو نہیں ہے. لیکن سب اسی کیفیت پر گواہ ہیں اور شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہاں کے باکمال اہل سخن کی صحبت میں اظہار کے کسی نئے پیرائے لیلائے سخن کے کئی نئے روپ ذہن میں

اجاگر ہوتے رہے ہیں۔ جن کو شعر میں ڈھالنے کی انگیخت ہوتی رہی۔ مثلاً انتساب والی نظم جو وقتاً فوقتاً کئی مہینوں تک لکھی جاتی رہی اس کا کوئی بند ماسکو میں ہوا ہے کوئی سوچی میں کوئی لندن اور کوئی کراچی میں یہ نظم دراصل پابلو نرودا کی صحبت سے ذہن میں آئی تھی اور انہی کے تتبع میں لکھی گئی۔"

الیا ہرن برگ اور فیض

الیا اہرن برگ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فیض نے ان کی اس تقریر کا حوالہ دیا جو اہرن برگ نے ۱۹۶۳ء میں ہونے والی ادیبوں کی کانفرنس میں ادیبوں کے بعض اعتراضات کے جواب میں کی۔ اہرن برگ نے کہا "آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کچھ اچھی چیزیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہاں کے جدید ادب کا بہت سا حصہ سپاٹ اور بے کیف ہوتا ہے جسے تخلیقی اعتبار سے معیاری ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نے انقلاب برپا کیا تھا اور سوویت معاشرہ تشکیل دیا تھا تو ہم نے آپ سے اور ساری دنیا سے یہ اقرار تو ضرور کیا تھا کہ ہم ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے جا رہے ہیں۔ ہم سرمایہ داری، جاگیرداری، مطلق العنانی استحصال اور وہ سب خباثت ختم کر دیں گے۔ جو طبقاتی نظام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب وعدے تو ہم نے کیے تھے اور ہم انہیں پورا بھی کر چکے ہیں لیکن ہم نے یہ کب عہد کیا تھا کہ ہم گھٹیا ادب پیدا نہیں کریں گے اور یہ کب کہا تھا کہ ہماری ادیبوں کی تنظیم میں کچھ لوگ دم قسم کے لوگ بھی بقراط بن کر نہیں بیٹھ جائیں گے۔ خیر اس بات کو چھوڑیئے آپ یہ بتائے کہ جسے آپ گھٹیا یا غیر معیاری ادب کہتے ہیں وہ کس زبان میں، کس ملک میں اور کس دور میں اچھے اور بڑھیا ادب کے مقابلے میں زیادہ کثرت سے پیدا نہیں ہوا۔ آپ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے آپ کے ہاں جو ہر روز سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں لچر یا بچگانہ کتابیں چھپتی ہیں ان کے مقابلے میں سنجیدہ اور معیاری ادب کے کتنے

نمونے سال بھر میں سامنے آتے ہیں۔ چلیئے ہمارا ادب بے کیف ہے، سپاٹ ہے بے مزہ ہے، لیکن آپ کے تجارتی اداروں کی طرح اس میں زہر اور کیچڑ کی ملاوٹ تو نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سارترے فیض سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "میری ہرگز یہ مراد نہیں کہ بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی ہمت آفریں، شجاعانہ ہیروانک موضوع چاہیئے جس میں انسان اپنے سے کسی بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوتا ہے ادب میں یونانی زمانے کے دیوی دیوتا اور ان کے کارندے تو باقی رہے نہیں جن سے پرانے زمانے کے ہیرو نبرد آزما ہوا کرتے تھے ۔ اب تو یہ تصادم مادی، معاشرتی اور سیاسی طاقتوں ہی کے خلاف ہو سکتا ہے بھوک افلاس، پس ماندگی، جبر و تشدد، اجتماعی درد و غم اور اجتماعی جہد و مشقت و نجات ایثار و استحصال یہ موضوعات اگر کہیں ادیب کو دستیاب ہیں تو وہ ایشیا اور افریقہ ہی کی سرزمین میں ہیں یا پھر مختلف صورت میں سوشلسٹ ممالک میں جہاں انسان انسان سے نہیں فطرت یا تجربے سے محوِ پیکار ہے اور تسخیر فطرت سے بڑا موضوع اور کیا ہوگا ؟ بھوک، بیماری، غریبی، غلامی وہ سب کچھ ہم پیچھے چھوڑ گئے ہیں اب کوئی براعظم ہمارے پاس فتح کرنے کو نہیں، اپنے ملکوں کے سب کونے کھدرے کھنگال لیے، کوئی بڑا موضوع ملتا ہی نہیں، طبقاتی کشمکش کا تناؤ، فلاحی نسخوں نے ڈھیلا کر دیا ہے اب تو یہی ہے کہ جنس اور لاشعور پر بیٹھے گھٹیا جذبات کے کیڑوں کا شکار کھیلا کریں۔ یا ماورائی خلاؤں میں مختلف مفروضات کے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر کسی کو لکھنے اور سوچنے کا ڈھب آتا ہے تو وہ ان کے بارے میں بھی اچھی کتابیں لکھ لے گا اور اچھی کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی کتاب کو ہومر شیکسپیئر یا ٹالسٹائے کے مقابلے میں تو نہیں رکھ سکتے۔"

فیض اور ٹریڈ یونین

فیض کی مختلف عملی سرگرمیوں کے متعلق ان سے اکتوبر ۶، ۱۹۷۶ء میں گفتگو ہوئی اور کہا کہ صرف یہ کہہ دینے سے بات نہیں بنے گی کہ آپ فلاں فلاں انجمنوں یا اداروں کے صدر سیکرٹری یا کارکن رہے۔ ذرا تفصیل سے بتائیے کہ آپ نے کیا کام کیا اور اس وقت کیا ماحول تھا۔ اپنے امرتسر کے قیام کا زمانہ یاد کرتے ہوئے کہا ترقی پسندی اختیار کی اور بہت کچھ پڑھا بھی مگر سوچا کہ صرف پڑھ لینے سے کام نہیں چلتا میدانِ عمل میں جا کر ہوا کا رخ دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو فضل الٰہی قربان سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں یہ ایک سیاسی کارکن تھے۔ روس میں رہ کر وہاں کے حالات دیکھ چکے تھے انگریزوں نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی تھی، کھلے بندوں پھر کر کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے روپوش تھے۔ انڈر گراؤنڈ۔ انہوں نے بشیر احمد بختیار سے تعارف کرایا جو ٹیکسٹائل ورکرز یونین کے یا سیکرٹری تھے یا کوئی اور عہدیدار۔ ان کا دفتر امرتسر شہر کے اندر تھا مگر صنعتی علاقہ شہر کے باہر جہاں مزدوروں کے مکانات بھی تھے۔ بیشتر مزدور سکھ تھے چند ایک مسلمان ہوں گے۔ اس علاقے کو "چھہرٹا" کہتے تھے۔ مسلمانوں کے محلے کا نام اسلام آباد تھا جہاں مسلمان کھڈیاں چلاتے تھے یہ ایک طرح کی گھریلو دست کاری تھی۔

ان علاقوں میں کام شروع کیا۔ کام درس و تدریس کا تھا۔ مزدور نہ تو لکھنا پڑھنا

جانتے ہیں نہ ان کی کوئی معلومات ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے ہنر اور صنعت کی الف ب بھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایسی مخلوق کو ان کی سطح پر اترکر اور ان کی ذہنی صلاحیتوں اور حافظے کی قوتوں کو سامنے رکھ کر تاریخ، جغرافیہ، بعض معاشرتی علوم وغیرہ پڑھانے اور سمجھانے کی ذمہ داری قبول کی۔ ہٹلر اور مسولینی کی انسانیت، تہذیب بلکہ پوری زیست کے خلاف ریشہ دوانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ سب ان مزدوروں کو سمجھایا اور پھر اپنے ملک کے حالات بتلائے کہ یہاں کس کس قسم کے مفادات ہیں، کہاں ان کا ٹکراؤ اور کس سے ان کا گٹھ جوڑ ہے، آزادی کی تحریکوں کا تجزیہ کیا، معاشرتی مسائل سمجھائے تمام گتھیوں کا حل بتایا جسے چاہے اشتراکیت کا نام دے دیں یا کسی اور نام سے پکاریں۔ سارا مقصد یہ بتایا کہ معاشرے میں طبقات نہ ہوں، معاشی اونچ نیچ نہ ہو، پیداوار کی تقسیم میں ہر ایک کو اس کا حق ملے، کسی دوسرے کا حق غصب کرنے کا موقع نہ ملے، ہر سطح پر عدل و انصاف کا راج ہو۔ مزدوروں کو یہ بھی سمجھایا کہ ہر مذہب انصاف کی تلقین کرتا ہے اس پورے کاروبار اور تبلیغ علم میں کسی ٹریڈ یونین یا کسی پارٹی کا نہ کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ ممبر بنے بلکہ ایک خاموش کارکن کی طرح کام کیا۔ مجھ سے کہنے لگے ہماری ان سرگرمیوں کو تم "عمل" میں شمار کر دیا نہ کرو یہ تمہارا عمل ہے۔

انجمنِ اسلامیہ کے حالات خراب ہو گئے تو فیض نے امرتسر کالج کو خیرباد کہا اور لاہور چلے گئے۔ بی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو سے انہیں ملازمت کی پیش کش ملی مگر انگریز کی نوکری ناپسند کی قبول نہیں کی۔ لاہور کی ٹریڈ یونین بہت پرانی تھی۔ ایک رملیش چندر چارلی تھے تانگہ یونین چلاتے تھے ان چارلی کا ذکر فیض نے اپنی اسیری کے ایک خط میں بھی کیا ہے، نواب زادہ محمود علی نظربند تھے نزیڈ لے احمد کی بیوی ہاجرہ تھیں۔ ان سے اور دوسروں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے ساتھ دو سال تک تنظیمی کام کیا۔

دلّی میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے تو ٹریڈ یونین کا کوئی کام نہیں کیا جنگ

کے بے پناہ کام ملے علاوہ دورے کرنے پڑتے تھے اور اس وقت وہ جنگی کام ٹریڈ یونین کی کسی اعانت سے زیادہ اہم تھے۔

فوج سے علیحدہ ہوئے اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہو کر لاہور واپس آگئے تقسیم کے وقت ٹریڈ یونین کے قریباً تمام اہم لیڈر جو غیر مسلم تھے نقل وطن کر گئے تھے۔ ہر طرف بالکل سناٹا تھا۔ ایک نئی تنظیم وجود میں آئی "پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن" صدر مرزا ابراہیم ہوئے اور نائب صدر فیض۔

ریلوے ورکرز یونین بہت بڑا ادارہ تھا۔ اس کا حلقہ کار بھی بہت وسیع اور پورے ملک کو گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔ یونین نے انہیں نائب صدر بنایا۔

اوپر جس ٹریڈ یونین فیڈریشن کا ذکر ہے اس کے علاوہ بھی ایک ادارہ تھا فیڈریشن آف لیبر تقسیم سے پہلے بھی ہندوستان میں یہ دو فیڈریشنیں تھیں جو دراصل دو مختلف نقاط نظر کی نمائندگی کرتی تھیں یعنی بائیں اور دائیں بازو کے خیالات جنہیں انگریزی میں لیفٹسٹ اور رائٹسٹ کہتے ہیں، پاکستان بنا تو یہاں بھی بائیں اور دائیں بازو کی جماعتوں نے ترتیب وار ٹریڈ یونین اور فیڈریشن آف لیبر نام کے دو ادارے بنائے۔

فیض نے پہلی بار ۱۹۴۸ء میں سان فرانسسکو میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۹ء میں جنیوا میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کی جانب سے کی جانے والی کانفرنسوں میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔ مختلف ممالک نے عالمی فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کو جنم دیا تھا۔ ان کانفرنسوں میں امریکیوں نے کوشش کی کہ ایک ایشیائی ٹریڈ یونین بن جائے۔ ان کا مقصد عالمی فیڈریشن آف ٹریڈ یونین میں پھوٹ ڈالنا اور انہیں براعظموں کی بنا پر اور دوسرے طریقوں سے تقسیم کرنا تھا۔ فیض کہتے ہیں ان اجلاسوں میں ہم نے ایشیائی ٹریڈ یونین نہیں بننے دی مگر جب امریکیوں کا اختیار رہا تو انہوں نے اپنا مقصد حاصل

کرلیا۔ عالمی سطح پر بھی اور پاکستان میں بھی۔

فیض پوسٹل ورکرز اینڈ لوئر گریڈ اسٹاف یونین کے صدر بھی منتخب ہوئے سیکرٹری مولوی گلچیں تھے۔ پشاور سے کراچی تک یونین کو منظم کیا۔ فیض کے دوست اور اب کراچی میں ان کے مستقل میزبان اے شکور جو ۱۹۷۶ء میں بہ حیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل محکمۂ ڈاک سے ریٹائر ہوئے فیض کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ پوسٹل یونین کے مسائل نہایت سلجھے ہوئے اور شیریں انداز میں پیش کرتے تھے۔ نہ طول طویل بحث کرتے، نہ غصے میں آتے اور نہ کوئی ضمنی بات چھیڑ کر کسی نکتے کو الجھاتے۔ جہاں وہ یونین کے مفاد کے محافظ بن کر گفتگو کرتے۔ وہیں وہ محکمے کی جائز اور واضح مجبوریوں کو یک لخت نظر انداز نہ کرتے جیسا کہ ایسی انجمنوں کے بیشتر لیڈروں کا عام رویّہ ہوتا ہے۔ میں نے دو برس پہلے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔ شکور بتاتے ہیں فیض نے ڈاکیوں کی انجمن کی صدارت اس نقطۂ نگاہ سے سنبھالی کہ وہ ڈاکیوں کو سب سے زیادہ قابلِ رحم مخلوق سمجھتے تھے اور انہوں نے بساط سے زیادہ ان کے لئے کام کیا۔ ان کی وکالت کرتے تو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ یہ صرف طرفدار ہیں معاملہ فہم نہیں۔ ان سے ڈاک کے افسر بھی خوش رہتے اور ڈاکیے بھی، ڈاکیے تو صدارت چھوڑنے کے بہت بعد تک بھی خوش رہے۔"

فیض احمد فیض

محصور بیروت کی ایک جھلک

زہیر محسن کا ماتم اور یاسر عرفات کی سالگرہ

یاد آیا ہے کہ جب کئی برس پہلے ہم نے دیارِ فرنگ میں بن باس لیا تھا تو اپنے پرانے دوست میر خلیل الرحمٰن کی فرمائش پر جنگ کے لیے اپنی بادیہ پیمائی کا احوال لکھنا شروع کیا تھا۔ ابکے پھر وہی کیفیت ہماری ہے اور مرزا ظفر الحسن کی وساطت سے دوبارہ حسینوں کی حکایاتِ خونچکاں بیان کرنے کا ارشاد پہنچا ہے۔ ابکے گھر سے نکلے ہوئے ایک برس سے دو چار ماہ اوپر ہو چکے ہیں اور اس دوران میں ہندوستان، انگلستان، ازبکستان، تاجکستان، فرانس، ہنگری، کینیڈا، امریکہ، روس، ایتھوپیا، (ابی سینا) انگولا، لبنان، بلغاریہ، غرض کہاں کہاں کی خاک ہمیں چھانی ہے اور ہر شجرِ سایہ دار کی مسافر نوازی کا احوال بجائے خود ایک دفتر چاہتا ہے۔ خامہ انگشت بدنداں ہے کہ حکایت شروع کہاں سے کیجئے۔ اب طے کیا ہے کہ شروع کے بجائے آخر سے شروع کرتے ہیں کہ ارضِ لبنان، فلسطینی حریت پسندوں کی آماجگاہ، بیروت کا شہر جو کبھی عروس البلاد کہلاتا تھا اور بطلِ حریت یاسر عرفات کی ذات دینی اور جذباتی طور سے ہم سب کے زیادہ قریب ہے۔

کوئی پندرہ برس ہونے کو آئے جب بیروت شہر اور لبنان کی حسین و جمیل سرزمین کو پہلی بار دیکھا تھا، جب اس شہر میں دولت کی ریل پیل تھی، جگہ جگہ سیاحوں کے ٹھٹ لگے تھے، بین الاقوامی

تجارت زر کی منڈی، سارے متموّل شیوخ کی تعیش گاہ، دنیا بھر کے ساہوکاروں، سرمایہ داروں، خفیہ ایجنٹوں اور نوسربازوں کا اڈہ، اس عروس البلاد میں کیا کچھ نہیں تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے عالیشان ہوٹل، جگ مگ جگ مگ عمارتیں، رقص گاہیں، ریسٹورنٹ، قمار خانے اور شہر سے گزر کر سرسبز پہاڑیوں کی اوٹ میں فوار العلیاس اور فوار السخرہ کی قسم کی تفریح گاہیں جنھیں "جنات تجری من تحتھا الانہار" کے نمونے پر بنایا گیا تھا، دودھیا آبجو میں رواں ہیں، فوارے چھوٹ رہے ہیں اور سرو و صنوبر کی سایہ دار روشوں پر کیسے کیسے پری چہرہ محو خرام ہیں۔ گزشتہ بار سمندر کے اسی کنارے پہلے ایک آدھ دن ہوٹل میں قیام رہا اور پھر یوسف خاں یعنی محبوب الہند دلیپ کمار کے بھائی احسن خان ہمیں اپنے عالیشان فلیٹ میں اٹھوا لے گئے ایکے اپنے میزبان معین بسیو دجن کی تعریف بعد میں بیان ہوگی) کے ساتھ پھر یہاں سے گزر ہوا تو نا دیدۂ عبرت بیں آثار مدائن را" کا نقشہ سامنے تھا۔ ایک آدھ ہوٹل، دو تین ریسٹورنٹ اور خال خال عمارت ضرور باقی ہے ورنہ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر ہیں۔ جلی ہوئی لاریوں ٹرکوں اور موٹر کاروں کے ڈھانچے ہیں کہیں محض ایک دروازہ کھڑا ہے، کہیں ایک ادھ جلی دیوار باقی ہے پرانے ریسٹورانوں اور رہائشی عمارتوں کی جگہ پناہ گیروں کی جھگیاں ہیں، بساطی، نانبائی، خوانچے والے، کھوکھے والے آبسے ہیں۔ آپ کراچی کی کسی مہاجر آبادی کا تصور کر لیجئے، عمارتوں کے خرابوں کے بیچوں بیچ جہاں کبھی سرسبز لان اور باغات تھے اب یا چٹیل میدان ہے یا خس و خاک کے انبار ہیں۔

جہاں اب مرغزاریں ہو گئی ہیں
یہیں پہلے بہاریں ہو گئی ہیں

لیکن یہ صرف تصویر کا ایک رُخ ہے، یہ ساحلی علاقہ وہ مقام ہے جو خانہ جنگی کے دوران شہر کے بعض دوسرے محلوں کی طرح میدانِ کارزار بنا اور عیسائی فاشسٹ ملیشیا اور اسرائیلی حملہ آوروں کی مشترکہ یورش سے تباہ و برباد ہوا لیکن اندرونِ شہر میں جلکے جہاں فلسطینی حریت پسندوں کا تصرف ہے اور جہاں ایک بہت ہی بڑھیا قسم کے ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا تو

اکا دکا عمارت کے علاوہ اس شکست و ریخت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے سب کاروبار معمول پر ہے، دکانیں ہر طرح کے ساز و سامان سے لدی پھندی ہیں، پھلوں ترکاریوں اور کھانے پینے کی چیزوں کی افراط ہے لوگ مطمئن اور خوشحال نظر آتے ہیں اگرچہ اپاہج اور بھکاریوں کی بھی کمی نہیں، سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم ہے کہ موٹر پے موٹر چلی آتی ہے اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ ٹریفک کا سپاہی کم ہی دکھائی دیتا ہے، ایک آدھ ٹریفک لائٹ سے بھی ہم گزرے، لیکن وہ کام نہیں کر رہی تھیں، لوگ بھاگ سڑک کے دونوں جانب جہاں جی چاہے گاڑی پارک کر دیتے ہیں اور بیچ میں اگر ایک گاڑی کسی وجہ سے رک جائے تو سڑک کی ناکہ بندی ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ٹریفک چلتا ہے اور نہ بھی چلے تو لوگ جھنجھلانے اور ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے صد شکر کر کے بیٹھے رہتے ہیں۔

بیروت جانے سے چند ہی دن پیشتر ایفرو ایشیائی ادیبوں کی انجمن کے پانچ سالہ عام اجتماع کے سلسلے میں جنوبی افریقہ کی ایک نو آزاد مملکت انگولا کے صدر مقام (LUANDA) لوآنڈا میں تھے۔ آپ نے غالباً پڑھا ہوگا کہ یہ ملک جو پانچسو سال سے پرتگالیوں کے قبضے میں تھا پہلے ایک طویل جنگ آزادی اور پھر اس سے بھی زیادہ خونریز خانہ جنگی کے بعد اب ایک آزاد خود مختار جمہوریہ قرار پایا ہے۔ اس فتح مندی کے تین چار برس بعد بھی یہ شہر اتنا اُجاڑ اور ویران ہے کہ آج کل کے بیروت کے مقابلے میں اسے آج کل کی الفنسٹن اسٹریٹ (یا جو کچھ بھی اب اس کا نام ہے) کے مقابلے میں پرانا لالوکھیت کہ لیجئے (انگولا کا احوال پھر کبھی بیان کریں گے)۔

اب شاید آپ یہ پوچھنا چاہیں کہ ہم بیروت گئے کس خوشی میں تھے، عجیب اتفاق ہے کہ اب کے بھی اس سفر کی غایت وہی تھی جو پہلے سفر کی تھی وہ یوں کہ ان دنوں بھی ہم نے لندن میں کچھ زمانے کے لیے ہی باس نے رکھا تھا یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے، اس سے کوئی چار برس پہلے تاشقند میں ایفرو ایشیائی ادیبوں کی انجمن قائم ہوئی تھی، ہم نے لندن سے بکار معاش

کچھ کیا کر کی تعمیل میں (جنگ کے لیے کچھ لکھنے کے علاوہ) اس انجمن کی منتظم کو یہ تجویز لکھ کر
بھیجی کہ اس تنظیم کا کوئی رسالہ یا مجلہ بھی ہونا چاہیئے جس میں مختلف ایشیائی اور افریقی ممالک
کی ادبی تخلیقات کے تراجم چھپ سکیں، جواب ملا کہ بسم اللہ تو پھر کنڈی کھولیے اور جا کر دیکھئے
کہ اس کی اشاعت کے لیے کونسی جگہ موزوں ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے بیروت
اور اس کے بعد بغداد، قاہرہ، الجزائر وغیرہ کئی جگہ جانا ہوا جس کی رپورٹ تو میں نے لکھ کر بھیج
دی لیکن یہ تجویز برسوں کھٹائی میں پڑی رہی اور آخر ۱۹۶۸ء میں قاہرہ سے جو انجمن کا صدر مقام
قرار پایا تھا ایک سہ ماہی رسالہ LOTUS لوٹس کے نام سے چھپنا شروع ہوا، اس کے مدیر اعلیٰ
ایک مصری ادیب اور صحافی یوسف السباعی مرحوم چنے گئے جو انجمن کے جنرل سیکرٹری بھی تھے
اور بعد میں صدر سادات کے وزیر ثقافت اور ان کے مشیر خاص بھی، جب صدر سادات نے
اسرائیل سے پینگیں بڑھانی شروع کیں تو یہ بھی یروشلم ان کے ساتھ گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی دو
برس پہلے کسی منچلے نے قبرص (سائپرس) میں ان کا کام تمام کر دیا، جب سے یہ رسالہ تو لستم پلستم
کے طور پر چھپتا رہا لیکن مدیر اعلیٰ کی جگہ خالی پڑی رہی اس لیے کہ انجمن کی جنرل کانفرنس یا
عمومی اجلاس کی منظوری لازمی تھی، گزشتہ جون کے اواخر میں یہ اجلاس انگولا میں منعقد
ہوا تو قرعہ بنام من دیوانہ زدند" اور ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ اس کا عربی ایڈیشن قاہرہ
کے بجائے بیروت سے چھپے گا، اس کی پیشکش پی ایل او کی جانب سے فلسطینی ادیبوں کے
نمائندہ جناب یاسر عرفات کے مشیر ثقافت اور عربی کے ممتاز شاعر معین بسیسو اپنے ساتھ
لائے تھے، معین سے ہماری دیرینہ یاد اللہ ہے، نہایت خوش لباس، خوش مزاج اور بانکے
چھبیلے آدمی ہیں، نوجوان تو نہ کہنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے حساب سے جوانوں ہی کی صف میں شامل
ہیں، انگولا سے ماسکو واپسی پر معین نے تجویز کی کہ باقی تفصیلات طے کرنے کے لیے ہم ان
کے ساتھ بیروت چلیں، ہم نے عذر کیا کہ بن بلائے کیسے چل دیں، وہاں سے اپنی جماعت کی
طرف سے باقاعدہ دعوت بھجوایئے، ہفتے بھر کے بعد ماسکو میں فلسطینی سفیر شارع صاحب کا

پیغام آیا کہ (TELEX) پر آپ کے نام یاسر عرفات صاحب کی ذاتی دعوت وصول ہوئی ہے۔ فوری طور سے بتلایئے کہ آپ کب جا سکتے ہیں۔ ماسکو سے ہفتے میں دو دن بیروت ہوائی سروس جاتی ہے۔ اپنا اندازہ تھا کہ بیروت کا جہاز تو خالی ہی جاتا ہوگا، کسی کو بے وجہ اس اوکھلی میں سر دینے کی کیا پڑی ہے لیکن یہ قیاس بالکل غلط نکلا اور کافی دوڑ دھوپ کے بعد جگہ ملی، پتہ چلا کہ سالانہ تعطیلات کی وجہ سے سب عرب طلبہ گھر کو لوٹ رہے ہیں اور ماسکو میں ان کی تعداد سینکڑوں سے کچھ اوپر ہی پہنچتی ہے۔ لبنان کا ویزا حاصل کرنا اپنی جگہ الگ مسئلہ ہے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ لبنانی سفارت خانے میں صرف ایک ہی نفر متعین ہیں اور وہ مشکل ہی سے ہاتھ آتے ہیں، چنانچہ ہم ویزا کے بغیر ہی چل دیے، البتہ اپنی آمد کا تار بیروت بھجوا دیا وہاں کے ہوائی مرکز کا تصور کچھ اپنے ذہن میں یوں تھا کہ ہر جانب ہوا مار توپیں نصب ہوں گی، حفاظتی پہرہ ہوگا اور شاید ہمیں کسی مسلح دستے کے جلو میں شہر جانا پڑے، لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، بلکہ شاید ہمارے ہاں ایئر پورٹ پر کہیں زیادہ وردیاں دکھائی دیں گی۔ خیر ویزا کے بارے میں ایک بدمزاج صورت خاتون سے کچھ سوال جواب کے بعد ایک صاحب نمودار ہوئے اور ہمارا پاسپورٹ لیکر ویزا بنوا لائے، باہر معین انتظار میں کھڑے تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی، لیکن مرطوب فضا میں ابھی تک کچھ تمازت باقی تھی۔ معین نے کہا یوں تو ساحل پر بھی ایک آدھ ہوٹل بچ رہا ہے جہاں منظر زیادہ اچھا ہے لیکن حفاظتی مصلحت کے پیش نظر تمہارے لیے اندرون شہر ہی میں ایک ہوٹل کا انتظام کیا ہے اور پھر وہ میرے گھر سے قریب بھی ہے۔ تم کچھ دیر سستا لو پھر ابو عمار کے ہاں سلام کو چلیں گے' (ابو عمار یا ابا عمار یاسر عرفات کی کنیت ہے اور یہاں کے لوگوں میں وہ اسی نام سے پکارے جاتے ہیں،) میں نے کہا نہیں بھئی آج تو ہم نہ جائیں گے، اُن سے گفتگو کے لیے حواس تو یکجا کریں۔ وہ بولے نہیں آج تو صرف رسمی تعارف ہوگا اور ظہیر محسن شہید کی صفِ ماتم میں شریک ہونا بھی لازم ہے۔" اس پر مجھے دو چار دن پہلے کی خبر یاد آئی جس میں لکھا تھا کہ فرانس میں کینز کے مقام پر پی ایل او کے عسکری مشیر ظہیر محسن کو کسی شقی نے شہید کر دیا ہے۔

مغرب کے وقت ہم معین کے ساتھ ابو عمار کی منزل کو روانہ ہوئے، اب پہلی بار ایک مسلح سپاہی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہمارے ہوٹل کے کاروباری اور نسبتاً متمول علاقے سے گزر کر ہم شہر کے گنجان اور یوں کہیے کہ عوامی محلے میں داخل ہوئے، ایک گلی میں نکڑ پر ایک مچان نما فوجی چوکی سے ایک سٹین بردار فوجی نے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر معین کو دیکھتے ہی سلامی گزاری، ذرا آگے بڑھے تو کچھ نوعمر لڑکے، کچھ نوجوان، کچھ بڑی عمر کے لوگ ملے، گنتی میں بیس پچیس ہوں گے، کوئی گہرے انگوری رنگ کی باقاعدہ وردی میں، کوئی نیم وردی میں کوئی سادہ کپڑے پہنے ہوئے، ایک چھ سات منزلہ بہت ہی معمولی وضع قطع کے مکان کے سامنے ہم گاڑی سے اترے تو ان میں سے دو چار نے معین سے علیک سلیک کی ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر اسی لاابالی طور سے اِدھر اُدھر ٹل گئے، یہ تحریک فلسطین کے قائد اور فلسطین کی انتظامیہ کونسل کے صدر یاسر عرفات کا حفاظتی دستہ تھا، آپ کو ہمارے ہاں غالباً ایک معمولی تھانے میں بھی اس سے زیادہ ٹھاٹ باٹ دکھائی دے گا۔ اب ہم اس حویلی نما مکان میں داخل ہوئے بجلی غائب تھی، ڈیوڑھی میں کچھ لوگ نیم تاریکی میں بیٹھے دکھائی دیے، سیڑھیوں میں اندھیرا تھا کہیں کہیں ایک موم بتی جل رہی تھی، چوتھی منزل پر ایک تین یا چار کمروں کے ایک فلیٹ میں داخل ہوئے، پہلے کمرے میں ایک سپاہی اور دو چار اصحاب بیٹھے بہت آہستہ لہجے میں باتیں کر رہے تھے، معین نے اگلے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ہم یاسر عرفات صاحب کے دفتر میں داخل ہوئے، چھوٹا سا کمرہ تھا، سامنے کوئی ڈیڑھ مربع گز آہنی میز پر تین موم بتیاں جل رہی تھیں، یہاں یاسر عرفات بیٹھے تھے، پہلو میں ایک صوفہ تھا جہاں دو حضرات کچھ کاغذات لیے اُن سے گفتگو کر رہے تھے، آگے تین کرسیاں تھیں، ابو عمار نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور کہا آپ بیٹھیے میں ذرا اِن سے فارغ ہو لوں اور پھر اُن کاغذات پر متوجہ ہوئے، اس دوران میں نیچے سے کچھ پیغامات بھی آتے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ حضرات کاغذات پر دستخط لیکر رخصت ہوئے، ابو عمار دوبارہ اُٹھے بہت گرمجوشی سے گلے ملے، اهلاً وسهلاً، آج کی معذرت کہ آپ کی ٹھیک سے پذیرائی نہیں ہو سکی نیچے لوگ انتظار میں ہیں اس لیے آج کوئی بات بھی نہیں ہو سکے

گی، لیکن آپ تو گھر کے آدمی ہیں آپ سے کیا تکلف ہے، تین دن کے بعد یہ ماتمی رسومات ختم ہو جائیں تو اطمینان سے گفتگو ہو گی۔"

یاسر عرفات کے بارے میں پڑھا بہت کچھ ہے، تصویریں بھی بہت دیکھی ہیں لیکن بالمشافہ بات کرنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ جب اسلامی کانفرنس کی تقریب میں لاہور تشریف لائے تب بھی سوءِ اتفاق سے ہم شہر سے غیر حاضر تھے، البتہ زندہ دلانِ لاہور نے جس والہانہ انداز سے ان کا خیر مقدم کیا اس کا احوال بہت سنا تھا۔ کسی خیالی ہیرو سے پہلی بار ملنے پر جو کچھ ذہنی تناؤ سا ہوتا ہے وہ اپنے ذہن میں بھی تھا، لیکن ابو عمار کچھ اس انداز سے ملے جیسے ہمیشہ سے آشنا ہوں۔ میانہ قد، اکہرا بدن، گندمی رنگ، خشخشی داڑھی، اڑتے ہوئے بال، ملائم خدوخال، مدھم آواز، صورت شکل سے ایک بڑے انقلابی رہنما اور جری بطلِ حریت کے بجائے ایک شفیق اسکول ماسٹر معلوم ہوتے ہیں، تکبر، خشونت، یا خود نمائی کا کوئی شائبہ اُن کی ذات میں نہیں ملتا۔

اب ہم اُٹھ کر نیچے ڈیوڑھی میں آئے، ابو عمار باری باری سب سے گلے ملے، یہاں کے دستور کے مطابق آپس میں رخسار بوسی کی اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، بالکل وہی نقشہ تھا جو اپنے ہاں کسی ماتمی گھر میں ہوتا ہے، لوگ آتے رہے جاتے رہے، کوئی سفیر ہے کوئی فقیر ہے، کوئی افسر ہے کوئی ملازم ہے، کوئی سپاہی ہے کوئی رضاکار ہے، ایک سفیر صاحب اُٹھ کر گئے تو معین نے کہا اب تم رخصت مانگو تو چلیں، میں نے جا کر اجازت چاہی اور کہا مجھے افسوس ہے کہ میں اتنے اندوہناک وقت میں یہاں پہنچا۔ مجھے اس سانحہ کی اطلاع پہلے نہیں تھی۔ کہنے لگے نہیں بھئی یہ تو ہماری روزمرہ کی زندگی ہے، ہم میں سے ہر کوئی اپنی جان ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہے اور اب ہمارے دشمنوں کا منصوبہ یہی ہے کہ ہماری تحریک کے سربرآوردہ لوگوں کو باری باری سے ٹھکانے لگا دیں تاکہ جماعت کی کمر ٹوٹ جائے لیکن انہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ ہمارے ہاں شہید لہو کے ہر قطرے سے ایک نیا جانفروش پیدا ہوتا ہے، اور جب تک ہم میں سے کوئی ایک جان بھی باقی ہے ہم لڑتے جائیں گے، تم کل ٹھہیر

محسن کا جنازہ دیکھتے، وہ ماتم اور گریہ و زاری کا منظر نہیں تھا، عزم و ہمت کا جشن تھا۔

اس عزم و ہمت کا ایک ثبوت تو ضمناً اوپر بیان ہو چکا یعنی ہر چند کہ شہر ہ صرف ایک حصہ فلسطینی اور قوم پرست لبنانی عناصر کے تصرف میں ہے، جس سے ملا ہوا علاقہ فرقہ پرست عیسائی افواج کے ہاتھ میں ہے جنہیں اسرائیلیوں کی حمایت اور سرپرستی حاصل ہے اور جن سے آئے دن جھڑپیں بھی ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہاں کے رہنے والوں میں خوف و ہراس یا پریشانی اور سراسیمگی کا کوئی سراغ نہیں ملتا حتیٰ کہ ساحل سمندر کے علاوہ جہاں کچھ ہوا مار توپیں نصب ہیں اور جگہ جگہ ریت کے بوروں کی اوٹ میں چوکس سپاہی کھڑے ہیں اندرون شہر حفاظتی تدابیر بھی واجبی ہی سی ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ پی ایل او نے اپنے دفاتر ایک جگہ رکھنے کے بجائے مختلف گلیوں محلوں میں پھیلا رکھے ہیں، اسی طرح بعد میں معلوم ہوا کہ جس مکان میں یاسر عرفات صاحب سے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی ان کی اقامت گاہ نہیں ہے ان کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔

بات لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ اگلے دو دن فلسطینی خبر رساں ایجنسی الوفا، ان کے ہفتہ وار اور روزانہ جریدہ الثور، لبنانی روزنامہ اللواء کے دفاتر میں وہاں کے صحافیوں سے میل ملاقات میں گزرے اس کے بعد لبنانی ادیبوں کی انجمن کے عہدیداروں سے صحبت رہی، کچھ ایسے میگزین کے معاملات طے ہوئے، کچھ ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی (ایک آدھ گفتگو کا تراشہ ملفوف ہے)

وطن کی سیاسیات کے بارے میں تو ہم پردیس میں چپ سادھ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ گھر کی بات گھر ہی میں ہونا چاہیئے اور یوں بھی انگریزی محاورے میں اپنے گندے کپڑے سر بازار دھونے سے جگ ہنسائی کے سوا کیا حاصل ہے، لیکن دو امور جن کی بار بار تکرار ہوتی رہی، اُن میں اوّل تو پاکستان کے حالات کے بارے میں عام تشویش اور ہمدردی کا اظہار تھا اور دوم یہ شکایت کہ ہم اہل فلسطین اور اہل لبنان ہندوستان کی نسبت پاکستان سے اتنے زیادہ قریب ہیں، لیکن ہندوستان کی سیاست، ثقافت، تاریخ اور تہذیب کے بارے میں تو ہمیں کافی معلومات

ہیں لیکن پاکستان کے ادب و ثقافت کا ہمیں کچھ بھی علم نہیں، صرف ام کلثوم کی مہربانی اور عربی تراجم کی وجہ سے علامہ اقبال کا نام ضرور سن رکھا ہے۔ یہ شکایت کچھ نئی بھی نہیں، بیروت یا کسی ایک ملک سے مخصوص ہے، آج سے سولہ سترہ برس پہلے بھی جگہ جگہ پوچھتے تھے وہ کہ غالب کون ہے اور اب بھی یہی کیفیت ہے۔ ہمارے جو بزرگان قوم سرکاری دوروں پر سیر و سیاحت کے لیے نکلتے ہیں وہ بھی یہی کچھ دہراتے ہیں اور اس کے لیے اپنے سفارت خانوں کو مطعون کرتے ہیں۔ سفارت خانوں کا عذر یہ ہے کہ انہیں گھر سے سرکاری اعلانات، وزارتی بیانات اور پراپیگنڈا کتابچوں کے علاوہ جنہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کچھ وصول ہی نہیں ہوتا، وزارت خارجہ کا کہنا ہے کہ ادب اور ثقافت وغیرہ تو وزارت تعلیم کی ذمہ داری ہے، وہ کوتاہی کریں تو ہمارا کیا دوش (اور اب تو خیر سے ایک وزارت ثقافت بھی قائم ہو چکی ہے، دو نہ شد سہ شد) کوئی سرکار آئے کوئی جائے مرغے کی یہ ٹانگ وہیں کی وہیں رہتی ہے، لیکن یہ ناواقفیت کچھ ایسی یکطرفہ بھی نہیں، جدید عربی شعر و ادب سے واقفیت تو ذرا دور کی بات ہے، فلسطین ہی کا مسئلہ لیجئے جس سے ہمیں آج سے نہیں نصف صدی سے اور پر شدید جذباتی لگاؤ ہے، اہل فلسطین پر اپنوں اور بیگانوں نے مل کر کیا کیا مظالم ڈھائے ہیں۔ اس وقت فلسطین کے عرب باشندوں پر صیہونی حکمران جبر و تشدد کے کیا کیا حربے استعمال کر رہے ہیں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس مسئلے پر بھی ہماری معلومات کتنی سطحی اور نامکمل ہیں۔ اس کی تفصیل کا بیان تو کئی دفتر چاہتا ہے، لیکن اب جو کچھ سیکھا ہے اس کا خلاصہ پھر کبھی بیان کریں گے۔

بات ظہیر محسن مرحوم کے ماتم سے شروع ہوئی تھی، ہمارے آنے کے بعد تین دن تک شہر میں اُن کا سوگ منایا گیا، تمام شہر میں در و دیوار پر ان کی تصاویر اور ان کی زندگی اور خدمات کے اشتہار چسپاں تھے، یہاں ہر دفتر میں یاسر عرفات کے فوٹو کے ساتھ لبنان کے قوم پرست رہنما کمال جنبلاط شہید کے علاوہ ملا خمینی، ہوچی منہ، اور کہیں کہیں فیڈرل کاسترو کے ساتھ اب ظہیر محسن کی شبیہ بھی آپ کو نظر آئے گی۔

روانگی سے دو دن پیشتر یہ تقریبات ختم ہوئیں، اس دن معین ہمیں مضافاتی پہاڑیوں کی سیر کو لے گئے، یہاں پر حفاظتی انتظامات ذرا زیادہ ہیں اور ہر چیک پوسٹ پر گاڑی روک کر سرسری معائنہ کیا جاتا ہے، شہر سے کوئی پندرہ میل دور ایک پہاڑی ریستوران میں تعطیل کی وجہ سے بہت بھیڑ لگ رہی تھی، لبنانی لوگ کھانے کے بہت رسیا ہیں۔ سب سے پہلے تو دسترخوان پر نقل کے طور پر کوئی بیس چیزیں آپ کے سامنے چن دیں گے، کئی طرح کے سلاد، پنیر، رائتے، میوے، جن میں کچھ تک آپ کا ہاتھ بھی نہیں پہنچے گا، اس کے بعد مرغ و ماہی کے علاوہ دو چار قسم کے کباب وغیرہ وغیرہ، ویسے یہ تکلفات ہوٹل ریستوران وغیرہ میں ہی ہوتے ہیں، گھر میں کافی سادہ کھانا پکتا ہے، دوپہر ڈھلے واپس ہوٹل پہنچے تو معین نے بتایا کہ آج شام ابا عمار نے اپنی مرکزی کمیٹی سے ملوانے کے لیے تمہیں طلب کیا ہے، معین نے کہا کہ یہ بہت ہی غیر معمولی اعزاز ہے، مرکزی کمیٹی کے ارکان کی پہچان اتنی خفیہ رکھی جاتی ہے کہ کسی غیر ملکی سے ان کا شاید ہی کبھی سامنا ہوتا ہو۔

شام کے وقت ہم گلیوں محلوں میں سے ہوتے ہوتے ایک دوسرے مکان میں پہنچے، یہاں فوجی پہرہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ تھا اور چھٹی ساتویں منزل پر یاسر عرفات صاحب کا فلیٹ باہر سے مقفل تھا، فوجی محافظ نے ہمارے لیے دروازہ کھولا، ہمارے حساب سے یہ فلیٹ بھی ایک عام سفید پوش گھرانے کا مسکن سمجھ لیجیے، مردانے میں ایک بیٹھنے کا کمرہ یا ڈرائنگ روم جس میں ایک صوفہ اور چار پانچ آرام کرسیاں رکھی تھیں، اس سے ملا ہوا ایک اور چھوٹا کمرہ جو اسٹڈی یا دفتر معلوم ہوتا تھا اور بغل میں ذرا زیادہ بڑا کھانے کا کمرہ جس میں ایک لمبی میز پر کوئی دس بارہ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ جب ہم داخل ہوئے تو یاسر عرفات ابھی برآمد نہیں ہوئے تھے، ان کے پانچ رفقائے کار یعنی مرکزی کمیٹی کے اراکین بیٹھے تھے، باری باری سے سب گلے ملے، سب سے تعارف ہوا، (نام بتلانے کی اجازت نہیں) سب رواں انگریزی بولتے تھے، ذہین چہرے، کسرتی بدن، قریب قریب سبھی ہم عمر تھے، چالیس پینتالیس سال کے پیٹے میں

ہوں گے، انہیں کی زبانی معلوم ہوا کہ آج ابو عمار کی سالگرہ ہے اور یہ اسی تقریب کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ سب نے ہماری اور پاکستان کی خیر صلا پوچھی، اتنے میں یاسر عرفات آئے اور اسی گرمجوشی سے معانقہ کیا، علیک سلیک کے بعد میں نے کہا کہ عجیب اتفاق ہے چار دن پہلے غمی اور آج خوشی کے موقعہ پر آپ سے ملاقات ہو رہی ہے، آپ کو سالگرہ مبارک ہو، وہ ہنس کر بولے بھئی سچ پوچھو تو یہ میری پچاسویں نہیں بلکہ پہلی سالگرہ ہے اس لیئے اس سے پہلے تو مجھے اپنی سالگرہ کی اطلاع کبھی ہوئی نہیں اور آج بھی مجھے ریڈیو ہی سے اس کی اطلاع ملی، خاص طور سے جب سوویٹ یونین کے سربراہ لیونڈ بریژنیف کا تہنیتی پیغام پہنچا۔ اس کے بعد افروایشیائی انجمن اور رسالے کے بارے میں کچھ بات چیت ہوئی، پھر میں نے کہا کہ آپ کی تحریک، آپ کی سیاست اور بین الاقوامی امور کے بارے میں تو آپ کے خیالات سب کو معلوم ہیں، بس تو شعر و ادب کے بارے میں آپ سے انٹرویو چاہتا ہوں، پھر ہنسے کہنے لگے شاعری تو تم جانتے ہو ہم عرب لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہے لیکن اس سلسلے میں سرسری سوال جواب سے کچھ حاصل نہیں، بہتر یہ ہے کہ آپ کچھ سوالات لکھ کر معین کو دے جائیے میں فرصت میں جواب لکھ دوں گا (دیکھیئے یہ وعدہ کب وفا ہوتا ہے) اور یوں بھی اب ہم اہم، جدوجہد کے نازک ترین مرحلے سے گزر رہے ہیں، دشمنوں کا نرغہ ہے اور بعض دوستوں کے قدم ڈگمگا رہے ہیں، ہمیں اپنے زور بازو پر بھروسہ ضرور ہے لیکن عالمی سیاست کا نقشہ اس سرعت سے بدل رہا ہے کہ ہمیں ہر لحظہ چوکس رہنا پڑتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس سلسلے میں امریکی اخبارات اس بات کو ہوا دے رہے ہیں کہ آپ اور امریکہ کے درمیان مذاکرات کی طرح ڈالی جا رہی ہے۔ کہاں تک صحیح ہے کہنے لگے ہمیں اپنے مسلک سے ہٹانے کے لیے ڈورے ڈالنے کی کوششیں تو ظاہر ہے ہوتی ہی رہتی ہے، لیکن اس اشتہار بازی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کیمپ ڈیوڈ عرب صفوں میں جو رخنہ ڈالا گیا ہے اُسے اور پھیلایا جائے تاکہ اسرائیلی جارحیت کے خلاف بعض عرب ممالک کی مزاحمت نرم پڑ جائے، ساتھ ہی لبنان میں ہمارے

خلاف اسرائیل کو اپنی وحشیانہ کارروائیوں کے لیے زیادہ شہ ملے اور دنیا پر یہ ظاہر کیا جائے کہ اس مسئلے کا پرامن حل تلاش کیا جائے حالانکہ حقیقت اس کے عین برعکس ہے۔

ابھی بات جاری تھی کہ ایک پیاری سی بچی کچھ بنڈل لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور آ کے یاسر صاحب سے لپٹ گئی، یہ میری بھتیجی بھی ہے اور بیٹی بھی اس لئے کہ ہماری اپنی کوئی بیٹی نہیں ہے۔ اصل میں آج آپ کی میزبان یہی ہے۔" بچی نے کہا (نام ذہن سے اُتر گیا ہے) چلئے کھانا لگ گیا ہے، اُٹھ کر سب لوگ دوسرے کمرے میں گئے، میز پر پہلے کسی دال کا شوربہ سامنے آیا، پھر سادہ چاول، بغیر گوشت کے ساگ اور ایک سبزی کا سالن، نان اور سیخ کباب، جس میں تکلّف کا کوئی شائبہ نہیں تھا، البتہ کھانے کے بعد ایک بہت سا بڑا کیک کاٹنے میں ہم سب لوگ ضرور شریک ہوئے، پھر باری باری سے سب لوگ' یاسر عرفات کے ساتھی، محافظ سپاہی، ایک گھریلو ملازم، ہمارا ڈرائیور ابو عمّار سے گلے ملے اور حسبِ روایت رخسار بوسی کی' اس معاشرے میں منصب اور جاہ و مال میں تفاوت ضرور ہے لیکن باہمی میل جول اور نشست و برخاست میں محمود و ایاز، کوئی اونچ نیچ نہیں برتتے، یاسر عرفات اور ان کی مرکزی کمیٹی کے اراکین میں تو خیر ویسے ہی قائد اور مقلد کا کوئی رشتہ نظر نہیں آیا، اس کے بجائے یہ ملاقات بے تکلف دوستوں کی بیٹھک معلوم پڑتی تھی، لیکن باقی عملہ اور یہ عمائدین بھی آپس میں ایسے ہی بیٹھتے اٹھتے تھے اور عربوں میں یہ مساوات نمائشی نہیں جبلّی ہے، عربی زبان میں جی جناب کا ویسے ہی دستور نہیں' بزرگی یا علم و فضل کے احترام میں السیّد یا استاذ ضرور مستعمل ہیں' لیکن فلسطینی حریت پسندوں میں یہ القابات بھی متروک ہیں اور کامریڈ یا رفیق کے بجائے قائدین کو الاخ یا بھائی پکارا اور لکھا جاتا ہے'۔

رخصت کا وقت ہو رہا تھا، یاسر عرفات نے چلتے وقت کہا میں نے سُنا ہے کہ آپ لاہور سے ہیں' اُس شہر اور وہاں کے رہنے والوں کی انتہائی خوشگوار یاد اب تک دل میں زندہ ہے، واپسی پر انہیں میرا سلام پہنچا دیجئے۔"

تجزیہ

سجاد ظہیر

اور

فیض

لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم

اس قربت کے باوجود جو ہمارے مابین ہے ان الفاظ کو لکھتے وقت میں سخت الجھن میں مبتلا ہوں۔ فیض کا تقریباً سارا کلام ان کے چار مجموعوں میں ہے، نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ اور دست تہ سنگ۔ یہی ان کی تخلیقی زندگی کی مکمل داستان ہے، خوش قسمتی سے ہم میں سے بہتوں نے انہیں بار بار پڑھا ہے، یہ ان کے اپنے لفظوں میں بیان کی ہوئی داستان ہے۔ اصل، سچی، اندرونی، نجی، دلچسپ اور بڑی خوبصورت داستان۔ اس کے علاوہ اور اس سے بہتر میں یا کوئی دوسرا شخص کیا کہہ سکتا ہے؟۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آخر لوگ کسی فن کار کی خارجی، روزمرّہ کی زندگی، اس کے عادات و خصائل، اس کی سماجی حیثیت اس کی چال ڈھال، اس کے بات کرنے یا شعر پڑھنے کے انداز، وہ کہاں پیدا ہوئے۔ اس نے کتنی اور کہاں تعلیم پائی۔ علانیہ اور خفیہ کتنی عورتوں سے اس نے محبت کی۔ اس کا سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کیا ہے اور اسی قسم کی بہت سی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں یقینی ہم ان باتوں کے معلوم ہو جانے کے بعد اس فن کار کے کردار کو سمجھ لیں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ اس پر کیسے کیسے اثرات پڑے، جس نے اس کے فکر و نظر کو متاثر کیا۔ یہ بھی جان لیں گے

کہ وہ کیسا آدمی ہے لیکن ولنے اور مٹی اور ہوا اور پانی اور سورج کی روشنی کے بارے میں سب کچھ معلوم کرنے کے بعد بھی ہم پھول اس کے رنگ کی دل آویزی اس کی پنکھڑیوں کی نرمی اور ملائمت اس کی اُڑتی ہوئی مہک، یعنی اس کی مجموعی لطافت اور اس کے حسن کا اندازہ کیسے لگا سکتے ہیں؟ وہ بنا تو ان ہی چیزوں کے میل سے ہے جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے لیکن ان سے کسی قدر مختلف ہے۔

انسان اخلاق کے میدان میں عام طور پر ایک بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور وہ ہے قول اور عمل کا تضاد، یعنی ہم کہیں کچھ اور، دعویٰ کریں کچھ اور، اور عمل کریں کچھ اور، ہمارا دیس رشیوں منیوں، صوفیوں اور اولیائے اللہ، درویشوں، بھگتوں اور مہاتماؤں کا دیس ہے، لیکن ہمارے ہی دیس میں بگلا بھگت کی اصطلاح بھی رائج ہے اور ہم میں سے اکثر نے خود گزشتہ تیس چالیس برس میں یہ ماجرا دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں ایک خاص قسم کی ٹوپی اور لباس جو کبھی دیش بھگتی اور پاکیزگی اور انکساری کی علامت سمجھے جاتے تھے اب عام ہندوستانیوں کی نظروں میں بالکل ان کے متضاد باتوں کے نشان سمجھے جانے لگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، کہ ہندوستان اور پاکستان بلکہ ان ملکوں کے باہر بھی جہاں فیض کے متعلق لوگوں کو علم ہے فیض کی غیر معمولی مقبولیت اور لوگوں کو اُن سے والہانہ محبت کا ایک سبب ان کی شاعری کی خوبیوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ لوگ فیض کی زندگی اور ان کے عمل، ان کے دعووں اور ان کے اقوال میں تضاد نہیں دیکھتے۔ گو کہ میری رائے میں اگر یہ تضاد ہوتا بھی تب بھی اس وجہ سے کہ فن کی دنیا کے قوانین، مروجہ اخلاقی قوانین سے اگر مختلف نہیں تو دوسری ہی سطح کے ہوتے ہیں ان کی شعری حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

میں مثال کے طور پر چند واقعات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو لاہور میں اپنے مکان سے اچانک گرفتار کر لیے گئے۔ اس وقت وہ پاکستان کے دو سب سے اہم اخباروں پاکستان ٹائمز اور امروز کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پاکستانی فوج کے چیف آف

دی جنرل اسٹاف جنرل اکبر خان اور کئی دوسرے فوجی افسران بھی بڑے ڈرامائی انداز میں گرفتار کر لیے گئے۔ سارا پاکستان ہل گیا۔ اخباروں میں روز یہ افواہیں شائع ہونے لگیں کہ ان سب لوگوں کو فوجی بغاوت کی سازش کے جرم میں فوراً گولی مار دی جائے گی، میں اس وقت لاہور میں تھا اور مجھ سے لوگوں نے آکر بتایا کہ کسی کو اس کا علم نہیں فیض کس جیل میں ہیں۔ کئی ہفتے تک ان کی بیوی اور بچیوں کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ نہ کسی کو فیض سے ملنے کی اجازت تھی۔ یہ بھی سنا گیا کہ فیض کو جیل میں جسمانی ایذا پہنچائی جا رہی ہے۔ (بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بات غلط تھی) البتہ دوسری باتیں صحیح تھیں یعنی وہ بالکل تنہا اور تکلیف دہ حالات میں رکھے گئے تھے۔ کوئی کتاب (سوا قرآن مجید کے) اخبار، رسالے یا کاغذ، قلم دوات تک ان کو نہیں دیا گیا تھا۔ نہ خود کچھ لکھ سکتے نہ کسی کا کوئی خط وغیرہ پا سکتے۔ مختصر یہ کہ حالات نہایت ہی روح فرسا تھے۔ انہیں حالات میں فیض نے وہ اپنا مشہور قطعہ کہا ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے!
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے!
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور اس مضمون کی وہ غزل بھی کہی۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے — جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی !! — ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے — تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

میں نے فیض کا یہ کلام خود ان کی زبانی حیدر آباد سندھ کے جیل میں سنا۔ اس لئے کہ ان کی گرفتاری کے تقریباً تین مہینے بعد میں بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور راولپنڈی سازش کیس کے کل قیدی ایک اسپیشل ٹرین میں لاہور سے حیدر آباد سندھ پہنچائے گئے۔ یہ اسپیشل ٹرین اور

اس کا سفر بھی عجیب و غریب اور دراصل اسپیشل تھا۔ ہم تیرہ قیدی ایک ہی ٹرین کے الگ الگ ڈبوں میں تھے۔ ہر ایک قیدی دو اسٹین گن سے مسلح سپاہیوں اور ایک انسپکٹر پولیس کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں حراست میں تھا۔ ہم ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ ہم کو یہ پتہ تھا کہ دوسرے ڈبے میں کون ہے۔ لیکن یہ موقعہ ان باتوں کے بیان کرنے کا نہیں اور نہ اب اس کی کوئی خاص اہمیت ہے۔ جیل کے اندر ہماری ملاقات ہوئی اور جب ہم نے اپنی آپ بیتیاں سنانے کے بعد فیض سے پوچھا کہ شاعری کا کیا حال ہے تب انہوں نے ہم کو اپنی یہ تازہ چیزیں سنائیں۔ کاغذ قلم نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت تک تین مہینے میں کیا ہوا۔ کلام دراصل لوحِ دل پر ہی لکھا ہوا تھا۔ حیدرآباد میں جب ہمیں قلم اور کاغذ رکھنے کی اجازت ملی تب یہ کلام بیاض میں قلم بند کیا گیا۔

حیدرآباد سندھ کے جیل خانے میں ہم تقریباً دو سال رہے۔ ایک اسپیشل ٹریبونل جو جیل کے اندر ہی بیٹھتا تھا۔ اس کے سامنے ہم کو روزانہ پیش ہونا پڑتا تھا اور ہم وکیل سرکار کی بحث اور جرح اور صفائی کے وکیلوں کا جواب سینکڑوں گواہوں کی گواہیاں، یہ سب سنتے رہتے تھے۔ عام طور پر یہ چند گھنٹے نہایت بورنگ ہوتے تھے۔ ملزموں کے کٹہرے میں ہم سب تیرہ ملزم دو صفوں میں بیٹھتے تھے۔ دوسری یا آخری صف کے بائیں سرے پر میں اور فیض پاس پاس بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہتے اور سامنے پڑی ہوئی کاپی پر کبھی کارٹون بناتے، کبھی گواہوں کی شہادت پر اپنے نوٹ لیتے۔ ہم تعزیرات پاکستان کی بے شمار دفعات میں ماخوذ تھے۔ جن میں سب سے سنگین فوجی بغاوت کے ذریعہ حکومتِ پاکستان کا تختہ الٹنے کی سازش اور فوج میں بغاوت پھیلانے کا الزام تھا جس کی سزا موت تھی۔ ہمیں اس وقت ہنسی آتی تھی جب ہمارے خلاف جھوٹی گواہیاں پیش ہوتی تھیں۔ ان موقعوں پر کبھی کبھی ہم یا ہمارے ساتھی بے ساختہ ہنس دیتے جو عدالت کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا۔ اس پر اسپیشل ٹریبونل کے صدر جسٹس عبدالرحمٰن جن کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی غصے سے بالکل لال پیلے ہو جاتے (وہ بہت گورے چٹے

تھے) اور زور زور سے چلا کر ہم کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے اور اگر اس پر بھی کسی کو اور زیادہ ہنسی آتی تو وہ دھمکی دیتے تھے۔

اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے والے جج کو ناراض کر لینا اور بھڑکانا کوئی دانشمندی نہیں تھی، لیکن ہم بھی آخر مجبور تھے۔

ان دنوں ہم لوگ ہر پندرہ دن پر چھٹی کے دن ایک طرحی مشاعرہ کرتے تھے۔ جس کے لیے شعر کہنا ہر قیدی کے لیے لازمی تھا۔ دراصل یہ فیضؔ کے خلاف ایک سازش تھی تاکہ ان کو شعر لکھنے پر مجبور کیا جائے۔ ان ہی حالات میں فیضؔ نے وہ غزل لکھی۔

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ان ہی دنوں ایک دن ہم نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی کہ انارکلی میں ایک خوبصورت لڑکی جس کے کندھوں پر بالوں کی گھٹا چھائی تھی ہنستی بولتی گذر رہی تھی۔ ایک مولانا کسی دوکان پر بیٹھے تھے۔ ان کو یہ منظر دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے سخت غصہ آیا اور اس بے پردگی میں انہیں اسلام کی توہین نظر آئی۔ چنانچہ وہ ایک قینچی لئے ہوئے اپنی جگہ سے کودے اور لپک کر اس بیچاری لڑکی کی زلفیں کاٹ دیں۔ خیر اس مداخلتِ بیجا پر مولانا پکڑے گئے اور ان کو سزا ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے فیضؔ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی غزل میں یہ شعر لکھا۔

دلبری ٹھہری زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف لہرانے کا نام

ظاہر ہے کہ ان حالات میں سب سے زیادہ رُوحانی تکلیف ہمیں اس وقت ہوتی تھی جب ہم پر غداری یا وطن دشمنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اس کی صفائی ہم اُس عدالت میں کیا پیش کرتے جو بنائی ہی اس لیے گئی تھی کہ خاص قانون کی مدد لے کر (راولپنڈی سازش کے

مقدمے کے لیے ایک خاص قانون بنایا گیا تھا جس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ یہ مقدمہ خفیہ طور چلایا جائے گا۔ اور اس کی روداد کے کسی حصے کو بھی مشتہر کرنا بجائے خود جرم ہوگا) تمام ملزموں کو کسی نہ کسی طرح سزا دی جائے لیکن فیضؔ چپ نہیں بیٹھے اور اپنی متعدد نظموں، غزلوں، قطعات اور منفرد اشعار میں انہوں نے اپنی ایسی بے مثال صفائی پیش کی کہ ان پر الزام لگانے والے خود ہی مجرم نظر آنے لگے۔ اس قسم کی نظموں میں "دو عشق" اور "نثار میں تیری گلیوں پہ" خاص طور پر ان کیفیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ "دو عشق" میں فیضؔ نے نئے اور بے مثال استعاروں کا استعمال کیا ہے۔

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

تنہائی کی کیفیتوں کا بیان ہر شاعر اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اور آج کل کے بعض شاعروں اور مفکروں نے تو اس کو باقاعدہ فلسفہ بنا لیا ہے اور اپنی مفروضہ تنہائی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں جتنا زور ایک خدا کو ماننے والے مسلمان اللہ تعالیٰ کی تنہائی اور یکتائی کو دیتے ہیں لیکن آپ ذرا فیضؔ کی اس دردناک لیکن حسین تنہائی کا تصور کیجئے۔ جس میں دستِ صبا کی نرمی اور ٹھنڈک محبوبہ کے ہاتھوں کی یاد دلاتی ہے اور چاند کے خم کو دیکھ کر دوست کی غیر موجودگی میں اس کے گلے میں باہیں ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔

انسانی آزادی اور انسانی وقار کی قدر و منزلت، انسانی رشتوں میں خلوص و محبت، شرافت اور پاکیزگی، انسان پر ہونے والے ہر قسم کے جبر و ظلم و استحصال رعونیت فرعونیت کے خاتمے اور ان مقاصد اور اس بلند نصب العین پر پہنچنے کے لیے ایسی کاوشوں اور سپردگی جیسی کہ عاشق تقریباً مجنونانہ طور پر اور سخت روحانی، نفسیاتی اور جسمانی مجاہدے مجادلے

کی کیفیت میں کہتے ہیں۔ فیض کی بہترین شاعری کے موضوعات یہی ہیں۔ ان کا لہجہ کبھی نرم، ملائم اور سست رو، کبھی سخت، تیز اور رواں دواں، ان کے علائم اور تمثیلات کبھی سادہ، کبھی پیچیدہ، بات کبھی براہِ راست، اور خطیبانہ کبھی تہہ بہ تہہ ہزاروں پردوں اور نقابوں میں ڈھکی چھپی۔ مثلاً دیکھئے اس قطعہ کا آہنگ کتنا بلند اور پُرشور ہے۔

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی،
ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کج کُلہی!

اور کبھی اس بات کو آہستہ سے مسکرا کر یوں کہہ دیتے ہیں۔

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو
بام ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو
جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

فیض کی سہل اور سادہ شاعری کی بات آئی تو ایک دلچسپ واقعہ اور سُن لیجئے۔ حیدرآباد سندھ کے جیل میں ہم پر پہرہ دینے کے لیے جو وارڈر مقرر تھے ان میں ایک صاحب تھے جن کو سب لوگ نواب صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حضرت گورے چٹے اور کافی موٹے تازے تھے۔ ہر وقت پان کھائے رہتے تھے اور سندھی اور پنجابی پہریداروں کے درمیان ویسی ہی وردی میں ملبوس ہونے کے باوجود اپنی صاف و شستہ اُردو اور اس کے لہجے کی وجہ سے فوراً پہچانے جا سکتے تھے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ لکھنؤ کے ہیں اور شیش محل کے

نوابوں کے خاندان کے۔ ویسے پاکستان پہنچ کر یوپی اور حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے مہاجروں میں سے بہت سے لوگ نواب بن گئے ہیں۔ بہر حال ان صاحب کو جب معلوم ہوا کہ فیضؔ شاعر ہیں اور میں لکھنؤ کے ایک جانے بوجھے شیعہ خاندان کا فرد تو ہم دونوں میں خاص دلچسپی لینے لگے۔ ہم بھی وارڈوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جن کے جذبۂ ہمدردی سے فائدہ اُٹھا کر ہم اُن سے چھوٹے موٹے غیر قانونی کام لے سکیں (جسے جیل کی اصطلاح میں تکڑم کہتے ہیں) ظاہر ہے کہ نواب صاحب شاعر بھی تھے۔ اپنی ہلکی پھلکی غزلیں فیضؔ کو سُناتے اور فیضؔ سے کلام سُنانے کی فرمائش کرتے لیکن فیضؔ کا کلام سُن کر تھوڑی سی رسمی تعریف کرکے چپ سادھ لیتے۔ ایک دن انہوں نے چپکے سے مجھ سے کہا حیدر آباد میں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ فیضؔ صاحب ذرا اچھی سی غزل لکھ دیں (یعنی ویسی نہیں جیسی فیضؔ عام طور سے کہتے ہیں جو نواب صاحب کو زیادہ پسند نہیں آتی تھی) تو بڑا اچھا ہو اور نواب صاحب اُسے مشاعرے میں پڑھ دیں گے۔ میں نے فیضؔ کو نواب صاحب کا پیغام پہنچا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس لکھنؤ والے پر تمہارے کلام کا کوئی رعب نہیں پڑا ہے۔ اگر اسے خوش رکھنا ہے تو اس کے مطلب کی کوئی چیز کہو۔ فیضؔ بولے بھئی تم لکھنؤ والوں کو خوش کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ آخر میں سیالکوٹ کا پنجابی ہوں لیکن چلو کوشش کرتے ہیں۔ البتہ نواب صاحب سے کہہ دو اس کے عوض میں ہمارے لئے ایک شراب کی بوتل فراہم کریں[ك]۔

نہ گل کھلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے

دو ایک دن ہی میں فیضؔ نے نواب صاحب کی فرمائش پوری کر دی اور یہ غزل لکھی ؎

ك۔ بوتل کے دام فیضؔ نے ادا کیے تھے۔

تیری صورت جو دل نشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

اس غزل میں نواب صاحب کی خاص پسند کے یہ دو شعر تھے ۔

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکرِ جنّت بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

نواب صاحب بھی وعدے کے پکّے نکلے ۔ ایک دن شام کو چپکے سے جن کی ایک بوتل جیب میں رکھ لائے اور میرے حوالے کر دی ۔ گرمیوں کے دن تھے ہم نے بڑے اہتمام سے اُسے شام کے وقت شربت میں ملا کر پی ۔ لیکن اس دن کے بعد پھر جیل میں پینے سے توبہ کر لی ، شراب دراصل آزادی اور خوش دلی کے ماحول میں پینے کی چیز ہے ۔ دل گرفتگی اور حبس اور سو ہزار محرومیوں کے عالم میں اس کے اثر سے دل کی خرابی میں اضافہ ہوتا ہے ۔

دیر ہو رہی ہے ۔ اب مجھے ختم کرنا چاہیئے ۔ ان حکایتوں اور لطیفوں کی تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور آپ شاید انہیں سن کر بور بھی نہ ہوں ۔ فیض کو اتنا جو چاہتے ہیں ، لیکن ختم کرنے سے پہلے میں آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ میری رائے میں فیض کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کی شاعری کو اُن واقعات اور حالات اور محرکات سے وابستہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے (حالانکہ انہوں نے اس کی تخلیق میں مدد کی ہے کہ ان کی تخلیق ایک خاص سرزمین میں پیوست ہونے کے باوجود اس سے الگ مختلف اور منفرد ہے ۔ اس شعر و شاعری کی محرکات اس کا لازمی جزو سہی) لیکن فیض کے تخلیقی جینئس سے گذرنے کے بعد ان کی حیثیت ثانوی اور فروعی ہو جاتی ہے اور جو چیز ہم کو ملتی ہے وہ ہے فیض کی روح اور نفس اور فکر اور تخیّل کی تعمیر کا حیرت ناک اچھوتا پن اور بے مثل صنّاعی اور حسن و

لطافت اور پاکیزگی اور طہارت کی ایک بے پایاں جستجو۔ جیسے کہ بہار کے موسم میں مختلف پھولوں سے روش کسی باغ میں ملی جلی انجانی مہک سے بھری عطر بیز ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں ہوتی ہے۔ آپ اسے محسوس کر سکتے ہیں اس کو پکڑنا اور پہچاننا مشکل ہے اس لئے کہ ان کی جیسی اور کوئی دوسری چیز نہیں اور نہ ہی فن کا عروج ہے۔

محمد علی صدیقی

فیض احمد فیض —
"سروادیٔ سینا" کے بعد

فیض احمد فیض کی شاعری اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ جدید اردو شاعری کے اُن بانیوں میں سے ہیں جنھوں نے شاعری کی دیوی کا "پجاری" بننے کی بجائے اُسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فن اور نظریۂ ادب کے بہت سے معرکوں میں اس قدر ثابت قدم رہے ہیں کہ وہ اب محض اپنے رنگ ہی کی وجہ سے مثالی شخصیت نہیں ہیں بلکہ اپنی فکر کا فنی روپ اور قابلِ تقلید روپ بن چکے ہیں۔

فیض احمد فیض ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جب فراقؔ اور جوشؔ بھی بقیدِ حیات ہیں۔ لیکن فیض کا معاملہ جُدا ہے۔ فیض نے اپنی منفرد شناخت کے لیے جس رنگ کو بطورِ خاص "کلچر" کیا ہے وہ اس قدر سادہ، پُراسرار، موثر اور پیچیدہ ہے کہ وہ اپنے شعروں میں ایک جادوگر کی طرح، کبھی کسی ایک عنصر کی افراط سے اور کبھی دُوسرے عنصر کی تفریط سے بہت عجیب و غریب کام لے لیتے ہیں۔ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا حاصل کر پاتے ہیں اُن کے تخلیقی کرب کی نوعیت کیا ہے۔ یہ سب بڑے اہم موضوعات ہیں لیکن فیض کا جواب ایک نہ ہوتے بھی، بڑی حد تک یہی ہے۔

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

فیض نے شاعری کی مشرقی روایت کے ساتھ مغربی روایت کے تجرباتی اور حسیاتی

رنگ کی کچھ اس طرح آمیزش کی ہے کہ وہ مغربی اور مشرقی روایت کے لئے بیک وقت قابل قبول ہیں، اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس دور میں اردو زبان کا سب سے معروف اور موثر شاعر کون ہے تو اُس کا جواب وہی ہے جو ہم جانتے ہیں۔

جب نقشِ فریادی، دستِ صبا اور زنداں نامہ کے بعد "دست تہِ سنگ" شائع ہوا تو بہت سے محبانِ فیض نے اپنے ممدوح سے اظہارِ عقیدت کا یہ طریقہ نکالا۔ "ہاں مجموعہ اچھا ہے، لیکن نقشِ فریادی والی بات کہاں؟ اگر ساٹھ سالہ شاعر کے چوتھے مجموعہ کا استقبال اس طرح کیا جائے کہ اُسے تیس سال پہلے کے مجموعہ کی یاد دلائی جائے تو حساس طبیعت پر کیا کچھ نہ گزرنا چاہیئے۔ فیض انگریزی روایت کے بڑے اچھے نباض ہونے کے ناطے، کناؤں اور اشاروں کی زبان کے بڑے اچھے کارگر بھی ہیں اور بیار کھ بھی۔ ویسے بھی ہمارے درمیان ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو اس نوع کی ہجو گوئی میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنے غیر معیاری اور ناقص پیمانوں کی مدد سے قدآور شعرا کا "قد" کم کرتے رہتے ہیں کہ شاید تاریخِ ادب میں ان کی نیش عقربی محفوظ رہ جائے۔ کچھ ایسے ادبا بھی ادب دوستی کے فریضہ پر گامزن ہیں جنھوں نے وطن دشمنی اور وطن دوستی کے مابین "فرق" مٹانے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسی وطن دوستی کو تسلیم کروانا چاہتے ہیں جو وطن کے حق میں نقصان دہ ہے۔ صریحی طور پر نقصان دہ ہے وہ اصلِ فن اور التباسِ فن کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دینے پر اس درجہ کمربستہ ہیں کہ شاعری اور ناشاعری کے سارے فرق مٹتے چلے جارہے ہیں۔

لیکن فیض احمد فیض دست تہِ سنگ کے بعد سروادیٔ سینا (۱۹۷۱ء) کی جانب اس پامردی کے ساتھ آگے بڑھے ہیں کہ ان کا فن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ گہرا اور خوبصورت ہوتا چلا گیا۔ جن حضرات نے سروادیٔ سینا کی اشاعت پر اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا اور شہر شہر یاراں کی اشاعت پر اپنی بدگمانیوں کو مبارکباد دی تھی۔ تیرے

دل مرے مسافرؔ کی اشاعت کے بعد فرطِ حیرت سے چکرا جائیں گے، وہ دیکھیں گے کہ شاعر۔ بڑا شاعر۔ بعض اوقات اس قدر زبردست چھلانگ (LEAP) مارتا ہے کہ وہ اپنے نقشِ اوّل کو نقشِ اوّل سے زیادہ رہنے نہیں دیتا اور وہ اپنے آخری دور کے کلام میں اپنے فن کی ساری بلندیوں کو بیک وقت پیش کر دیتا ہے۔ فیضؔ دو بڑی روایتوں کے طرحدار شاعر ہیں وہ اپنی "امیج" (IMAGE) سے زیادہ اپنی حقیقت پر نازاں ہیں اور اپنے چاہنے والوں کی بے پناہ چاہت پر گلوگیر بھی۔ کہ فیضؔ کے سامنے بلند نام بلند ہی رہتے ہیں۔ وہ اپنا قد پہچانتے ہیں۔ بڑے بڑے ناموں کا قد بھی۔ وہ تحسین و تعریف میں غلو کے حد درجہ خلاف ہیں۔ ہاں وہ اپنی شاعری اپنی روایت اور اپنے عوام سے حد درجہ پیار کرتے ہیں اور یہاں وہ کسرِ نفسی سے کام نہیں لیتے۔ "سرِ وادیٔ سینا" کے "انتساب" کی یہ سطریں گواہ ہیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام
آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتوں کا بن
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

فیضؔ کلرکوں، کرم خوردہ دلوں، زبانوں، پوسٹ مینوں، تانگے والوں، ریل بانوں، کارخانوں کے بھوکے جیالوں، بادشاہِ جہاں دہقان، دکھی ماؤں اور بلکتے بچوں کی قسمت پر آنسو بہاتے ہوئے جب حسیناؤں کی طرف آتے ہیں تو کچھ اور

بھی فیاض ۔ اور آزردہ ہوجاتے ہیں ۔ چونکہ وہ یہ کہنے کا یارا رکھتے ہیں :۔

اُن حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھِل کھِل کے
مرجھا گئے ہیں
اُن بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں

فیض کی شاعری میں یہی وہ جُز رسی ہے جو اُنھیں دوسروں سے ممتاز و ممیّز کرتی ہے وہ معاشرہ کے تمام حد و خال پر نظر رکھتے ہیں ۔ وہ حرکت اور جمود کے اسباب و علل پر تاریخ دان کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں ۔ خوشی کی بات پر چہکتے ہیں اور پژمردگی کی نشانیوں سے آزردہ ہوجاتے ہیں ۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ وہ زندگی کی تفہیم چاہتے ہیں ۔ اور تقدیس بھی ۔ زندگی کا علم ہی محبت و عمل کا جواز ہے ۔ یہ "انتساب" تاہنوز" ناتمام ہے ۔ اس لئے کہ فیض کے عرفانِ حقیقت اور حالات کی ستم ظریفیوں اور کٹ حجتیوں میں ملاپ ممکن نہیں ہے ۔ یہ انتساب ۱۹۷۱ء کے پُرآشوب ایّام کی یاد دلاتی ہے ۔ اگر کچھ لوگ اس پر ناک بھوں چڑھانا چاہیں تو بے شک وہ حق پر ہوں گے ۔ یہ انتساب جس قدر سچی ہے ، اسی قدر کڑوی بھی ، لیکن شاعری میں کڑواہٹ اور بدصورتی بھی مباح بلکہ خوبصورت ہوجاتی ہے ۔ یہ منفرد انتساب فیض کی وطن دوستی کا ایک ایسا محضر ہے جو فیکٹریوں ، کھیتوں ، کھلیانوں ، چوراہوں اور دانش گاہوں پر آویزاں ہے ۔ یہ محضر اُن حسین لوگوں کی یاد دلاتا رہے گا جو آنے والے دنوں کے سفیر بن چکے ہیں ۔ لیکن دوستی اور دردمندی کی حکایتیں زندہ رہتی ہیں ، ہر آنے والی صبح کے ساتھ فی الفور

آموجود ہوتی ہیں۔ اُن سے پناہ ملنی مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتی ہے۔ جب ناصر کاظمی مندرجہ ذیل شعر کہتے ہیں :-

گلی گلی مری یاد بچھی ہے ۔۔۔ پیارے رستہ دیکھ کر چل
مجھ سے اگر اتنی وحشت ہے ۔۔۔ مری حدوں سے دور نکل

تو یہ شعر ناصر کاظمی پر بھی صادق آتا ہے اور فیضؔ پر بھی ۔ اچھا شعر کسی ایک کی میراث نہیں ہوتا۔ فیض کی حدوں سے دور نکلنا امرِ محال ہے وہ بطور شاعر حد درجہ کے تکمیلیت پسند (PERFECTIONIST) وہ شعر کیا کہتے ہیں، حروف و معنی کی دلچسپ شطرنج کھیلتے ہیں۔ فیضؔ نے جدید اردو زبان میں علاقہ علاقہ کی خوب صورت شاعری پر تخلیقی ردِ عمل فراہم کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ اپنی حسین وجمیل امیجز (IMAGES) کی خوش کن پچی کاری کے باوجود اپنی شعری روایت کے اس درجہ پاسدار ہیں کہ روایت بھی فیضؔ پر بجا طور پر فخر کرے گی۔ فیضؔ وہبی (ORACULAR) شاعری کے پرچارک نہیں۔ وہ اپنی سطروں میں ایک ایک لفظ اس طرح سجاتے ہیں جیسے زردوزی کی مدد سے اپنی فکر کی تزئین کر رہے ہوں۔ اُن کے مزاج میں اس قدر موسیقیت ہے کہ وہ انقلاب کی زبان کے لئے بھی راگ (SYMPHONY) کا سہارا لیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے انقلاب اور شاعری علم موسیقی سے یک گونہ مناسبت رکھتے ہوں۔ فیضؔ حسنِ ترتیب کے قائل ہیں۔ دو دہائی قبل فیضؔ کی شاعری کے خلاف فنی سطح پر، اُٹھنے والے طوفان کا مقصد ہی یہ تھا کہ فیض کے اثرات سے باہر نکلا جائے۔ فیضؔ کے خلاف بغاوت کا علم بڑے کرّوفر سے بلند کیا گیا تھا، لیکن نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا۔ فیضؔ نے جدید اردو شاعری میں جس لہجہ اور فنی پختگی کا سہارا لیا ہے وہ اس درجہ "قاتل" ہے کہ اُس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔

"سرِ وادیٔ سینا" اور "شہرِ شہرِ یاراں" کے علاوہ فیض کے زیرِ طبع مجموعۂ کلام

"مرے دل مرے مسافر" کے تحولات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس صدی کے چوتھے عشرہ کے وسط میں "نقشِ فریادی" سے شروع ہونے والا سفر بلندیوں کی جانب گامزن ہے۔ "شہرِ شہر یاراں" اس سفر میں، زیادہ اہم مجموعۂ کلام نہ ہوتے ہوئے بھی "مرے دل مرے مسافر" کے موجودہ دور کی تفہیم کے لیے اشد ضروری ہے۔

فیض نے اپنی شاعری میں محبت و اخلاص کے جس چمن کی آبیاری کی ہے وہ ایک مبہم احساسِ ملال کے باعث "زرد پتوں" اور "درد کی انجمن" سے عبارت نظر آتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ بہار سے ناامید ہیں۔ ان کی شاعری میں اس قدر "کلوروفل" ہے کہ وہ زرد پتوں میں زندگی کی کارفرمائی دیکھ سکتے ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض حضرات نے یہ طے کر لیا ہو کہ وہ فیض کی شاعری کے اس مسیحا نفس رُخ کی جلوہ آرائی قبول نہیں کریں گے۔ فیض محبت اور دوستی کے شاعر ہیں۔ انسانی اقدار کے ... کی بالادستی کے شاعر ہیں۔

کوئی یارِ جاں سے گزرا کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیم ایک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

فیض کی وطن دوستی کا پرچم بین الاقوامیت پر کھلتا ہے، فیض نے عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر میں متعدد نظمیں کہی ہیں، لیکن وہ مندرجہ ذیل اشعار کے بھی خالق ہیں:-

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا
ہم ایسے سادہ دلوں کی نیازمندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

کمال یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار کہنے والا شاعر "سر وادیٔ سینا" کی جانب آتا

ہے تو چشم زدن میں طویل فاصلہ طے کرتا ہوا ملتا ہے ۔

؎ پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا، اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّا کرو، اِس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اُترے،
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

کیا فلسطینی حریت پسند اور اُن کے حامی اس نظم کے شاعر کے نظریاتی اور فنّی خلوص سے انکار کر سکتے ہیں؟ فیض احمد فیضؔ اپنی فکری اساس کے ساتھ پوری طرح متحد ہیں۔ شاعری، فیضؔ کے لیے، مشغلہ ہے نہ مشاعرے لوٹنے کا حربہ۔ یہ ایک انتہائی سنجیدہ کام ہے جو جامِ جم بھی ہے اور جامِ جہاں نما بھی۔ جبھی تو وہ "حذر کرو مرے تن سے" میں کہتے ہیں کہ:-

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا

نظم آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور فیضؔ جلد ہی اُس مقام پر آجاتے ہیں جہاں وہ اپنے منفرد، ہونے کا اعلان اس طرح کرتے ہیں۔

؎ حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے!
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے،
بجائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول

یہ دور فیض کی شاعری کا اہم ترین دور ہے۔ کچھ ادبی "بزرگوں" کا خیال ہے کہ فیض خود کو دہرا رہے ہیں۔ لیکن میری ناچیز رائے میں فیض اپنے قارئین کو آہستہ آہستہ اُس شاعری کے لیے تیار کر رہے جو موجودہ دور کی شعری بلندیوں سے آنکھیں ملاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کے مجموعہ "شہرِ شہر یاراں" کی نظم "اُمیدِ سحر کی بات سنو" ملاحظہ فرمائیے:-

جگر دریدہ ہوں، چاکِ جگر کی بات سُنو
الم رسیدہ ہوں، دامانِ تر کی بات سُنو!
زباں بُریدہ ہوں، زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں، ملالِ سفر کی بات سُنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سُنو
سحر کی بات، اُمیدِ سحر کی بات سُنو

اُمیدِ سحر کی خواہش پر اعتراض کیا جا سکتا ہے یا اس ترکیب پر، ویسے یہ دُرست ہے کہ فیض انقلابی شاعر ہونے کا مدعی نہیں ہے۔

وہ اوّل و آخر شاعر ہے۔

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں!
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں!
یہ سخن جو ہم نے رقم کئے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کوئی شامِ ہجر کی مدتیں
جو تمھاری مان لیں ناصحا تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں

مری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرّتیں

یہ اشعار سراسر روایتی ہیں لیکن شاعر اس درجہ شعوری ہے کہ وہ فنّی التزامات
بھول بھلیّوں پر دسترس ہی کو شاعری نہیں سمجھتا۔

وہ اگر "اُمیدِ سحر" کی بات کرتا ہے تو "جشن ہے ماتمِ اُمید کا، آؤ لوگو" جیسی دردانگیز
لم بھی لکھ سکتا، لیکن یہ سب "بسترِ خواب" سے جگانے کی کاوشیں ہیں۔ فیض احمد
یض نے "وطن" اور "محبوب" کو اس قدر مستقل مزاجی کے ساتھ موضوعِ سخن بنایا ہے
۔ وہ ایک کے ساتھ وصل کی حالت میں دوسرے کے ساتھ حالتِ فراق میں پائے
تے ہیں۔ یہ فیض کا اپنا تجربہ ہے، اگر بعض شعراء کے یہاں مثالی محبت کے لئے
یل صدرشک وطن کی شرط نہیں ہے تو اس مسئلہ پر گفتگو بیکار ہے، لیکن خوب
ے خوب تر کی خواہش پر کیوں کر قدغن لگائی جا سکتی ہے اور وہ بھی جمہوری اقدار
ی دعویدار معاشرہ میں! فیض کی شاعری میں لیلائے وطن ہی موضوعِ سخن ہے۔
ہ محبتوں کا راج چاہتے ہیں۔ وہ محبت جیسے مقدس رشتہ کی تقدیس کے لئے ایک
یسی جنتِ ارضی کا خواب دیکھتے ہیں جہاں کی حسینائیں "بے محبت ریاکار" جذبات
انسکار نہ ہوں۔ وہ اپنے گلشن سے اس درجہ محبت کرتے ہیں کہ خود گلشن بھی
یض کی شاعری کے پھولوں پر نثار ہے۔ فیض کی مشکل یہ ہے کہ اُن کی دروں بیں
مال پسندی معروضی حقائق کی کھردراہٹوں کے ملاپ کے باوجود بے سمت
۔ جودیت کا روپ نہیں دھار پاتی۔ وہ اپنی شناخت پر اصرار کرتے ہیں۔ اور اپنے
والوں کے ساتھ۔ ان کے یہاں حُب الوطنی ایک باطنی احساس کا نام ہے جس
ی صداقت، معروضی طور پر بھی پرکھی جا سکتی ہے اور لہجہ کی گھلاوٹ کے ذریعہ بھی۔
حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اردو شاعری کے جس دور میں زندہ ہیں وہ فیض

کا دور ہے، اس کے احساسِ جمال اور حسنِ تناسب کا دور ہے، یہ مستقبل سے
باہم پیوست ہونے کا دور ہے اور وہ فنکار اور معاشرے جو مستقبل کے ساتھ
مذاق نہیں کرتے۔ آنے والی نسلوں کے لیے زندگی کا حوصلہ اور رومانس ودیعت
کر جاتے ہیں۔

فیض احمد فیض کی شاعری مستقبل آفرینی کے عمل کی شاعری ہے یہ سرتاسر
حُسن کی شاعری ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جس شعری دور میں زندہ ہیں وہ فیض اور
فیض ہی سے عبارت ہے۔

امیر مغل

فیض کی شاعری چند تاثرات

دو شعر ملاحظہ ہوں۔

فانی کہتے ہیں:

فصلِ گل آئی یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے؟
یا کوئی وحشی اور آپہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا؟

اور فیض:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

ان دو انتہائی خوبصورت شعروں کی قدر و منزلت متعین کرنا یہاں مقصود نہیں بلکہ ان کے تقابلی جائزے سے فیض کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے فانی کا شعر غزل سے ہے، جب کہ فیض کا شعر ان کی مشہور نظم "نثار میں تیری گلیوں کے ...." سے ہے۔ اس لحاظ سے ان کا تقابل کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ لیکن جن جہتوں میں تقابل کرنا مقصود ہے، وہاں شاید اس کی گنجائش ہے۔

فانی کے ہاں درِ زنداں کھلنے سے فصلِ گل اور اجل آنے کے امکانات یکساں طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے پیدا ہونے والے نتائج بالآخر ایک ہی سمت میں سفر کرتے

نظر آتے ہیں۔

وحشت فرد کی شعوری ذمہ داری سے گذر جانے کی منزل ہے اور اس لحاظ سے شعور کی موت۔ قیدی چھوٹ جائے جب زنداں سے۔ اور یہاں زنداں قفس کے معنی میں ہے تو وہ اجل کی نشانی ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔

فیض کے ہاں درِ زنداں نہیں کھلتا۔ روزنِ زنداں کی بات ہے اور وہ بھی روزنِ زنداں کے بجھنے کی۔ لیکن شاعر کو گمان ہوتا ہے کہ اس کے محبوب کی مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی۔

فانی اور فیض دونوں آرائی سے پیدا ہونے والی صورت حال کا ذکر کر رہے ہیں ایک درِ زنداں کے کھلنے سے منفی نتائج اخذ کر رہا ہے اور دوسرا روزنِ زنداں کے بجھنے سے مثبت نتائج۔

دونوں شاعروں کی کائناتیں (جو ان شعروں سے مرتب ہوئی ہیں) زنداں کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں لیکن زندگی کے گراف پر متضاد سمتوں میں رواں دواں ہیں۔

فانی کے تلازمے روایتی غزل سے ہیں ان کی (CONSTELLATIN) وہی ہے جس کے لئے حالی اور آزاد نے آواز بلند کی تھی (یہ الگ بات ہے کہ حالی کی نظم سے ان کی غزل شاید بہتر ہے اور آزاد کی نظم کے مقابلہ میں اُن کی نثر زندہ و تابندہ ہے)

فانی کے ہاں یوں لگتا ہے جیسے روایت خود کار شاعری کر رہی ہو (عمر خیام والے فیٹز جیرلڈ کی زبان میں یوں کہیے کہ روایت کی انگلی لکھتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔

فیض نے تو اپنے شعر میں سیدھے سیدھے وطن کو محبوب بنایا ہے، لیکن اس کے تلازمے اور اندازِ بیاں غزل کا ہے (یہ شعر غزل میں بھی ہو سکتا تھا) اس کے باوجود روزنِ زنداں کے بجھنے، محبوب کی مانگ اور پھر اس میں ستاروں کی افشاں کی بات غزل کے روا

لہجے سے بالکل مختلف ہے،

اور اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ پہلا شعر فیض کا ہے اور دوسرا فانیؔ کا تو آپ اس کو اُردو شاعری کی روایت اور دونوں شاعروں کے مزاج سے ناواقف گردانیں گے۔

فیضؔ کے اوپر والے شعر میں تو محبوب ؔ وطن سے مخصوص کر دیا گیا ہے لیکن یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

یہ شعر خالصتاً غزل کا ہے۔ لیکن اس کے مفہوم کی جہت بھی ستاروں سے بھری جانیوالی مانگ والے شعر کی ہے۔

غزل کی روایت سے ایمائیے ایک عمومیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے شعروں کو مفاہیم کی ایک سے زیادہ سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے غزل کی کمزوری بھی کہا جاتا ہے اور اس کی توانائی کی نشانی بھی۔

لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ فیض کے اس شعر سے ذہن قفس کے اس مفہوم کی طرف کم کم جاتا ہے جو ہماری روائتی غزل کا سکہ ہے؟

شاید اس لیئے کہ فیضؔ کے ہاں قفس کے ذکر کے ساتھ ہی دل کے ستاروں کے اُبھر آنے کا ذکر آ جاتا ہے جو روائتی غزل سے پیدا ہونے والی توقعات سے بالکل مختلف ہے!

فانی کے شعر میں روائت غزل کے تمام تلازمے ایک نامیاتی وحدت کو تشکیل دے رہے ہیں۔ وہ قفس کی دنیا ہے اور اس میں وحشی بھی ہیں اور قیدی بھی، فصلِ گل بھی ہے اور اجل بھی۔ اس لیئے ذہن سب سے پہلے اسی دنیا کی طرف جاتا ہے اور پھر اس سے اس کے عمومی مفہوم کی طرف، جہاں فانی کا یہ شعر ان کے زندگی کی طرف منفی رویئے کی ایک خوبصورت مثال بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس درِ قفس والے شعر میں ایک نئی کائنات پیدا ہوتی ہے جس میں

نفس ہے، اندھیرا بھی ہے، لیکن اندھیرے کی مہر اسے روائتی لہجے سے مختلف کر دیتی ہے
ور پھر دل میں ستارے سے ابھرنے لگیں۔ یہ کائنات ہی اور کائنات ہے۔ جو روائت
، در شاعر کی نئی دنیا کے تجربے کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

اس کے باوجود یہ شعر غزل کا شعر ہے اور غزل کی عمومیت والی خصوصیت سے
ازاد نہیں فیض کے اس شعر میں کلاسیکی روائت میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن اس کے بعد غزل
کی روائت ہی بدل جاتی ہے اور یہ شعر غزل کی روائت میں آجاتا ہے۔

اس لئے غزل کی یہ خصوصیت کہ اس کے شعر مفاہیم کی کئی سطحوں پر سمجھے جا سکتے ہیں
ہیں، اس شعر میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ فیض کے اس شعر کو
پڑھتے وقت قفس سے ہمارا ذہن ایک اجتماعی صورت حال کی طرف جاتا ہے اور قفس
کو اس مفہوم میں سمجھنے میں کوئی کشش نہیں محسوس ہوتی جس میں فانی زنداں کو استعمال
کر رہے ہیں؟

یا پھر فیض کی مشہور غزل کے یہ شعر لیجئے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکرِ یار چلے

روائت میں داخل یہ شعر صرف فیض (یا مکتب فیض) سے ہی مخصوص ہیں۔
ان کے عمومی اشارے اپنے اندر ایک (PARTICULARITY) رکھتے ہوئے ہیں
بل معلوم ہے کہ وطن، گلشن، اور قفس میں کیا تعلق ہے۔
یہ تخصیص اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ یہ شعر فیض کے ہیں۔
برٹرنڈ رسل کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے ایک نقاد نے کہا تھا کہ فلسفی دو قسم کے

تے ہیں ایک وہ جن کے فلسفہ کو ان کی ذات سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے اور ایک جن کا فلسفہ ان کی زندگی سے معنی پاتا ہے جن کی صداقت اُن کی ذات کی صداقت منحصر ہوتی ہے۔ رسل کے فلسفوں میں سے بیشتر (جن کا تعلق عمرانی پہلوؤں سے ہے) وہ نقاد دوسرے زمرے میں شمار کرتا ہے۔

فیض غزل کہتے ہیں، لیکن ان کے غزل کے ایمائیے ان کی زندگی، ان کے عمل سے معنی لیتے ہیں۔

رومانوی شاعروں کے ہاں وہ بات جو فیض کی آزمائش پر پوری نہ اُترے، صداقت نہیں ہے۔

فیض کے ہاں، جو شعر عمل کی بھٹی سے پیدا نہ ہو، صداقت سے عاری ہے۔

فیض کے قاری فیض کو پڑھتے وقت اس بات سے آشنا ہیں۔ فیض اپنے قارئین کی توقعات کو بڑھا کر ایک ایسی اونچی سطح پر لے گئے ہیں، جہاں ان کے شعر ان کی زندگی سے مفہوم پاتے ہیں اور ان کی زندگی اُن کے شعروں کی اصطلاح میں سمجھی جاتی ہے۔

فیض عالم باعمل کی طرح باعمل شاعر یا دانشور کی اس صف میں ہیں جس میں کرسٹوفر کاڈویل، ارنسٹ ہیمنگوے، پابلو نرودا، لورکا اور اگستینو نیتو آتے ہیں۔

دنیا کو ان فلسفوں سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ جو دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان فلسفیوں کی انہوں نے پرستش کی ہے جنہوں نے دنیا کو بدلنے کی کوشش کی ہے کہ اصل کام یہی ہے۔

چنانچہ فیض کی غزل ایک مسلسل نظم ہوتی ہے اور نظم غزل کی خصوصیتیں لئے ہوئے فیض کی رومانویت، ان کی زندگی کے حوالے سے، حقیقت نگاری بن جاتی ہے۔

فن پارہ فن کار کے کسی صورت حال کی طرف جذباتی رویہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ فن کار کی شخصیت (اس کا باطن) اپنے ماحول کے ساتھ ایک عمل میں

داخل ہوتا ہے اور ان کے تعامل سے ایک جذباتی رویہ مرتب ہوتا ہے جو اس کے فن پارہ میں در آتا ہے۔

اب سوال یہی ہوتا ہے کہ فن کار اپنے ماحول سے کیا مراد لیتا ہے اسے کیا سمجھتا ہے، اور اس سے کس طریق سے معاملہ کرتا ہے۔

جب کہ فانی اپنے ماحول کے ساتھ تعامل میں اپنی ذات کے اُتار چڑھاؤ سے باہر نہیں نکل پاتے، فیض کے ہاں ان کے ماحول کا وہ حصہ ان کی ذات کے ساتھ تعامل میں شریک ہوتا ہے جو سماج کی بنیادی حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ فیض بھی خارج کو داخلیا رہے ہیں، لیکن ان کا خارج سماج کے بنیادی مسائل اور اس کی روح سے تعبیر ہوتا ہے۔

فیض کا اپنے خارج کے ساتھ تعامل انفعالی نہیں ہے۔ وہ اس کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس طرح ان کے باطن اور ان کے خارج دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جس سے ان کا خارج کے ساتھ تعلق ہر لمحہ حرکی نوعیت رکھے ہوئے ہے۔ وہ اور خارج ایک دوسرے کو بدل رہے ہیں۔

یہ وہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی صورت حال ہے جس کا مشاہدہ بلکہ تجربہ فیض کرتے ہیں اور اسے اپنی شاعری میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن ان کا حوالوں کا نظام مستقل ہے جس کے CO-ORDINATES قائم ہیں۔ اس سے ان کی شاعری جہاں لحظہ، لحظہ بدلتی صورت حال کی عکاسی کرتی ہے وہاں وہ اس صورت حال کو دیکھنے کے لئے ایک تناظر بھی مہیا کرتی ہے۔

فیض وطن، سماج اور دنیا بھر کی انسانیت کے روشن مستقبل کو بدلنے کی عالمگیر تحریک میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ تحریک ان کی شاعری کا تناظر بناتی ہے اور وہ اس تحریک کے قدم قدم کی گواہی دیتے ہیں ؎

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گذر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض کے ہاں محبوب ایک تجسیم ہے، اپنے تمام انسانی تلازموں اور گوشت پوست کے ساتھ، ان کے وطن کا، ان کے آدرش کا، تاریخی عمل کا، استقبالی حقیقت کا۔ ان کا محبوب فرد ہے جو ایک انجمن ہے جس کی تنہائی بھی محشر خیال ہے۔

فیض نظم "دو عشق" میں ارضی محبوب کے عشق کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

اور پھر کہتے ہیں۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

اور پھر۔

اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

فیض کے یہ دونوں عشق الگ نوعیت کے ہیں، لیکن وطن سے عشق کے اظہار میں انہوں نے جو امیجری استعمال کی ہے۔ وہی ہے جو ان کے ارضی محبوب کے لئے وقف ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں محبوب کا تصور ایک اجتماعی شان لئے ہوئے ہوتا ہے اور فرد کی تجسیم بھی۔

فیض سے پہلے اقبال نے غزل میں فرد سے گذر کے اجتماع، بلکہ آفاق کی طرف رجوع کیا۔ فیض اقبال کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن اقبال اور فیض کے لہجے مختلف ہیں

اقبال کے ہاں ایک پیغمبرانہ جلال ہے، ان کے ہاں گداز ہے۔ لیکن ان کی جلالی طبیعت ان کے گداز پر حاوی نظر آتی ہے اور ان کے کائناتی وژن کے باعث ان کے ہاں غزل کے روائتی مضامین کم نظر آتے ہیں۔

فیض روائت کو لے کر چلتے ہیں، لیکن روائت کو اپنی فکری اُفتاد کے مطابق اپنے مطلب کے لئے ڈھال لیتے ہیں۔

اقبال اور فیض دونوں فارسی اور اُردو میں فارسیّت کی روائت کو استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے ہاں فارسیّت کا جلال ظاہر ہوتا ہے۔ فیض کے ہاں فارسیت سراپا جمال بن جاتی ہے، فیض کی شخصیّت کی طرح۔

فیضؔ کا لہجہ دھیما ہے، اس میں ٹھہراؤ ہے، رچاؤ ہے، ایک اطمینان ہے، فیض فرصت کے شاعر ہیں۔

فیض کی شاعری کا مجموعی طور پر آہنگ ایک خراماں ندی کی طرح ہے جو میدانوں سے گذر رہی ہے، گو ہر ندی پہاڑ سے آتی ہے اور فیض کی شاعری بھی طوفانوں کو قوتِ مخفی (نغمہ POTENTIAL ENERGY) کی صورت لئے ہوتے ہے۔ لیکن ایسے کہ گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا۔

کیوں ؟

اس لئے کہ فیض کو یقین ہے کہ اُن کا محبوب مل جائے گا، بلکہ سچ پوچھئے تو محبوب ان سے جدا ہوتا ہی نہیں۔

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے
صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری
کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی
ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

اور پھر یہ کہ:-

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

کہا گیا ہے کہ فیض کے ہاں جذبۂ شہادت ایک غالب رویّہ ہے۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ لیکن اس میں تھوڑی ترمیم کی ضرورت ہے۔ فیض کو شہید ہونے کا شوق نہیں ہے لیکن ان کو شہادت سے گریز بھی نہیں ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ فیض اپنی تقدیر کو قبول کرتے ہیں AMOR FATI لیکن کیسی تقدیر؟ وہی تقدیر جسے المیّہ کی تنقیدی زبان میں اس مقولے کے ذریعے بیان کرتے ہیں کہ کردار منفرد رہے۔

فیض سمجھتے ہیں کہ تاریخی عمل کی اپنی منطق ہے، اور ایک حرکیت ہے وہ کسی کے رُکے تو رُکے گا نہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں کہ اس میں فرد کا کوئی کردار نہیں۔ فرد تو اس عمل کا ایک حصّہ ہے۔ اس کی اپنی قسمت تاریخی عمل کا حِصّہ ہے۔ فرد کی قسمت کو ماپنے، اس کی نوعیت، کامیابی، ناکامیابی کا مطلب تاریخی عمل سے متعین ہوگا۔

تاریخی عمل پر ایمان اور اس میں اپنی ذات کے مقام کا تعیّن کر لینے کے بعد فیض کے ہاں سب چیزیں اپنی اپنی جگہ تلاش کر لیتی ہیں، اور ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے، ایک نظم آجاتا ہے۔

فیض کو جس تقدیر سے پیار ہے، وہ تاریخی عمل سے متعلق ہے، اور تاریخی عمل کی سمت مثبت ہے۔

اس لئے فیض آرام سے چلتے ہیں، دھیرے سے قدم رکھتے ہیں، لیکن آگے کی طرف۔
بات اُن کے لہجے کی، ان کے ٹمپو کی ہو رہی تھی۔

فیض متوسط طبقے کے آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے جسے کہتے ہیں ناز و نعم میں پرورش پائی۔ آسودہ حال متوسط طبقے کے گھرانے میں انہوں نے اشرافیہ کی نفسی ملٹی پائی۔ اشرافیہ کی بہتر روایات میں علم دوستی اور سب سے بڑھ کر استغنا کا مرتبہ ہوا کرتے ہیں۔ فیض بھی اشرافیہ کی ان دولتوں سے مالا مال ہوئے۔

فیض کی طبیعت کا یہ اشرافی استغنا ان کے تاریخی شعور سے پیدا ہوئے ایمان سے

آہنگ ہے یہی ان کی شاعری کا بنیادی لہجہ، رنگ، آہنگ ہے۔
کہیں کہیں، خاص طور پر شروع شروع میں، فیض کے ہاں وہ رنگ نظر آیا جسے ساحر نے
منا لیا، لیکن وہاں بھی فیض ساحر کی نسبت کم ناراض، کم غصے میں ہیں۔
ایرک فرؤم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے جن لوگوں کو
بدی اور بھرپور گنی پگ بنایا ان میں بیشتر نازیوں کے انسانیت سوز رویے اور برتاؤ کے باعث
انسان سے حیوان بن گئے۔ ماسوا تین قسم کے لوگوں کے۔ یہ لوگ تھے رومن کیتھولک، اشراقیہ
اور کمیونسٹ، رومن کیتھولک اس لئے کہ ان کا اپنے مذہب پر ایمان پختہ تھا۔ اشراقیہ اس
لئے کہ وہ قسمت کے آتار چڑھاؤ سے بے نیاز تھے اور کمیونسٹ تاریخی عمل کی ناگزیریت اور
اس کے جبر پر ایمان رکھتے تھے۔
فیض کمیونسٹ ہیں یا نہیں، رومن کیتھولک بہر حال نہیں ہیں، لیکن اشراقی طبع
ضرور رکھتے ہیں۔
ایک دوسرے اصطلاحی نظام میں یوں کہئے کہ فیض صوفی ہیں جیسا اشفاق احمد
نے کہا اور ٹھیک کہا۔

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

فیض آتار چڑھاؤ سے مستغنی ہیں تو ان کے ہاں سرشاری کا عالم بھی پایا جاتا ہے
"تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر"

کہاں ہے منزل راہ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گذرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمال روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

اور پھر فیضؔ کہتے ہیں :۔

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی،
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے؟

اور سرمد نے بھی تو یہی کہا تھا کہ "قربانت شوم"
استغنا اور سرشاری اپنی جگہ پر، لیکن فیضؔ کے ہاں سطحی قسم کی رجائیت نہیں۔

فن کار جتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا ہی وہ حساس زیادہ ہوتا ہے، اتنا ہی وہ حالات کی پیشانی پر پڑنے والی شکنوں کے رنگ، ان کی تعداد میں کمی بیشی، چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ کے بے ساختہ پن، اس کی پیلاہٹ، اس کی آورد، حالات کی سنگینی، اور سازگاری منزلوں کے سنگلاخ ہونے، لوگوں کے مزاجوں میں تبدیلیوں کے سیز موگراف پڑھنے میں مشاق ہوتا ہے۔ اس کا دل سب کچھ دیکھتا ہے، اور وہ قلم بند ہوتا ہے۔

فیض کی شاعری میں یہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ اصطلاحی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی شاعری نفسیاتی حقیقت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ فیض کے رویّے سماجی عمل کی وسیع تر تحریک جسے وہ اپنا محبوب سمجھتے ہیں کے حوالے سے مرتّب ہوتے ہیں۔

اور محبوب کے جتنے رویّے ہوتے ہیں، اتنے ہی رویّے فیض کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کی شاعری میں وارداتوں کا جو تنوّع پایا جاتا ہے اس کا حدود اربعہ بہت ہی وسیع ہے، اور مضمون کے ایک نقشے کی بجائے اس کے لئے ایک اٹلس مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

تنوّع کی ایک فہرست ان کے ایک گیت میں ہے ؎

منزلیں، منزلیں
شوقِ دیدار کی منزلیں
حُسنِ دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں۔

اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے ؎

زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں۔
بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں،

اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں۔
قول و قرار کی منزلیں
منزلیں، منزلیں،

قدرتی طور پر، ایک باشعور اور انتہائی SOPHISTICATED شاعر، جیسا کہ فیض ہیں، کا فن وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی منزلیں مارتا ہوا آگے بڑھتا گیا ہے۔ وہ کھردرے پن جو پہلے نظر آتے تھے اب غائب ہو گئے ہیں (میں تو یہی کہوں گا کہ غائب ہو گئے ہیں جب کہ فن ایسا دین ہے جو کبھی مکمل نہیں ہوتا)

کیٹس کی طرح فیض فنی سالمیت (ARTISTLIN TRITY) کے سختی سے قائل ہیں انہوں نے غزل کی روائت کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں جا کر اب اُسے آگے بڑھنے کے لیے نئی زمینیں، نئے آسمان تلاش کرنا ہوں گے۔ اگر اس بات کو مبالغہ بھی سمجھ لیا جائے تو اس پر زور دینے کا مقصد سنگتراش کے پتھر کو مسلسل تراشنے سنوارنے کے اس عمل کی طرف توجہ دلانا ہے جو فیض اپنے لئے فرض کئے ہوئے ہیں۔

فیض کی تکنیک ہند۔عجمی شعری روائت کا نقطۂ عروج ہے جس کو فیض نے جدید مغربی شاعری کی تکنیکوں اور تجربوں کے ساتھ ملا کر اپنا خاص اسلوب پیدا کیا ہے۔

فیض کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ رجحان ایمائیت اور تاثریت کی طرف بڑھتا گیا ہے، غزل کی کلاسیکی روائت ان مغربی تکنیکوں سے مماثلت رکھتی ہے بلکہ ان کے مزاج بھی ایک جیسے ہیں۔

خاص طور پر فیض کی نظم، خاص طور پر رواں دور کی نظم، اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی رنگا رنگ تکنیکوں میں چند ایک کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

تجریدوں کو مجسّم کرنا شاعری کی ایک خصوصیت ہے کسی شاعر میں یہ زیادہ پائی جاتی ہے، کسی میں کم۔ فیض تجریدوں کو مجسم کرنے کے ماہر ہیں۔ شاعری اس کے بغیر ہو ہی

ہیں سکتی۔ لیکن فیض کے ہاں یہ ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا تقابل شیلی سے کیا جا سکتا ہے۔ شیلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تصورات کے ہیولے بناتا چلا جاتا ہے اور میتھیو آرنلڈ کے مشہور قول کے مطابق، وہ ایک فرشتہ ہے جو اپنے بے لغایت پر روشنی پھینکتے خلا میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ ایک اور نقاد کے مطابق، شیلی کی شاعری میں اٹلی کے آسمانوں کے بدلتے رنگوں کی طرح رنگ بدلتے ہیولے اٹھتے ہیں اور بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے شیلی کے ہاں بعض اوقات ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

تجسیم کا عمل فیض کی نظموں میں بالخصوص، ایک مسلسل عمل ہوتا ہے۔ تجسیم در تجسیم کا۔ وہ تجریدوں کے ہیولے بناتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح نئے باسیوں، خیالی باسیوں کی ایک نئی دنیا بنا ڈالتے ہیں۔

جب تجسیموں کا نیا جہان آباد وجود میں آجائے تو وہ ایک متھ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ شیلی اور فیض دونوں کے ہاں MYLTHOPOEA متھ سازی کا عمل کمال پر پہنچا ہوا ہے۔

فیض کی نظم "ملاقات" کو لیجیے:۔ اس کا پورا لسانی تجزیہ ممکن نہیں۔ صرف اشارہ کرنا ہے اس نظم کے متھ سازی کے پہلو کی جانب:۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

رات درد کا شجر اور پھر شجر کے استعارے کو آگے بڑھایا گیا ہے، "ستارے، عتاب، لمحوں کے زرد پتے گر رہے ہیں،" اور تیرے گیسوؤں میں الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں۔" رات کی سیاہی میں نہر خوں، غم بانہوں کے گلستاں میں سلگ رہا ہے۔

یہ ایک نظم ہے ایک واردات کو بیان کرتی ہوئی۔ ایک جذبے کا اظہار۔ یہ خارج سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اپنی ایک دنیا بناتی ہے، ایسی دنیا جو صرف تخیل میں وجود رکھ سکتی ہے، زمین پر کہیں اسے پایا نہیں جا سکتا کہ یہ دل میں جاگزیں ہے۔ یہ متھ ہے۔

متھ سازی کا عمل ایک شعری صنعت نہیں بلکہ علم کا ایک ذریعہ ہے، اپنے جذبہ اپنی واردات کو محسوس کرنے کا۔ محسوس کرنے کے لئے بادہ و ساغر کہے بغیر، بات نہیں بنتی۔ شاعر کے تخیل میں — زیادہ صحیح یہ کہ شاعر کے پورے وجود میں — واردات ایک ہلچل مچاتی ہے اور یہ واردات محسوس شکل میں آنے کے لئے بے قرار ہوتی ہے احساسات محسوسات کا روپ دھارنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے سامنے ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ غیر مادّی دنیا ہے اس لحاظ سے کہ یہ نفسیاتی دنیا ہے۔

"سنیئے" فیض کہتے ہیں۔

درد آئے گا دبے پاؤں، لئے سُرخ چراغ\
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے\
شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا\
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اٹھے گا

متھ سازی کے ذکر میں "یار" کا حوالہ ضروری ہے۔

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں\
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب

اور جب یہ نظم اقبال بانو کی آواز میں ہو تو آسمان زمین پہ اتر آتا ہے۔

شیلی سے اٹلی کے بدلتے رنگوں والے آسمانوں کے مقابلے میں فیض کو سنئے: "اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا، اسی کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کیفیت کا بعد میں بھی کبھی کبھی احساس ہوا ہے مگر اب نہیں۔"

اسی طرح کی شہادت ورڈز ورتھ کے بارے میں ہے کہ ابتدائی دور میں چلتے چلتے اسے ہر چیز تحلیل ہوتی نظر آتی تھی، حتیٰ کہ اسے اشیا کی حقیقیت (FACTITY) کا یقین کرنے کے لئے دیوار کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

فتح محمد ملک نے فیض صاحب کی اس کیفیت کو صوفی کی کیفیت سے منسوب کیا ہے شاعر کے ہاں یہ کیفیت عام ہوتی ہے باوجودیکہ فیض کے کہنے کے مطابق اب اس کیفیت کا احساس انہیں نہیں ہوتا۔ لیکن شاعری کی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ اس میں تخیّل اشیاء کو تحلیل کر دیتا ہے اور نئے مرکّب اور آمیزے تشکیل دیتا ہے۔

فیض کی متھ سازی کی خصوصیت کو اس سیال تخیل کی کارفرمائی سے متعلق قرار دے سکتے ہیں۔

رنگ اور اشیاء کی ماہیت بدلنے کی طرف فیض نے اشارہ کیا ہے وہ اور اس میں قرار لانے کی خواہش فیض کے ہاں بذاتہٖ ایک مضمون بن گیا ہے خاص طور پر جدید دور کی شاعری میں فیض کی طبیعت اب قرار چاہتی ہے۔

ایک پل ٹھہرو کہ اس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب، ید بیضا لے کر
ایک پل ٹھہرو کہ دریا کہیں پاٹ لگے

اور نیا دل میرا

زہر میں ڈھل کے، فنا ہو کے

کسی گھاٹ لگے

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا

اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے

کنارے آ لگے عمر رواں یا دل کی صورت

اور "دست تہ سنگ" کی نظمیں "رنگ ہے دل کا مرے" اور "پاس رہو"

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے

رنگ ہے دل کا مرے "خون جگر ہونے تک"

چمپئی رنگ کبھی، راحت دیدار کا رنگ

اور پھر فیض رنگوں کی ایک بساط بچھا دیتے ہیں۔

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اور پھر

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے

ایک جگہ پہ ٹھہرے

پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

فیض کی یہ قرار کی خواہش والی نظمیں عام طور پر اس وقت کی ہیں جب وہ وطن سے باہر یا وطن ہی میں کسی پر سکون ماحول میں ہوتے ہیں۔ جب ہنگامے دور نظر آتے ہیں۔ اس وقت فیض اس روحانی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہنا

چاہتے ہیں، لیکن جسے وہ اس دنیا میں اس ارضی مملکت میں قائم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا ایمان ہے کہ

الم نصیبوں، جگر فگاروں کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے

لیکن اپنی مثالی روحانی دنیا کا سکون جب وہ پا لیتے ہیں اسی دنیا کے کسی کونے میں تو انہیں علم ہوتا ہے کہ چند لمحوں میں یہ سکون درہم برہم ہو جائے گا۔ انہیں علم ہے کہ کیٹس بلبل کے نغمے کے ساتھ ایک الوہی دنیا میں چلا گیا تھا اور پھر اُسے واپس آنا پڑا تھا۔ ایسے موقع پر وہ چاہتے ہیں کہ اشیا کو، حالات کو قرار آ جائے۔ (STASIS) کی یہ شاعری امپریشنزم کی خصوصیتیں لیے ہوئے ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک جمالیت یا جمال پسندی (aestheticism) کی۔

اس قسم کی شاعری میں شامل وہ نظمیں بھی ہیں جو منظر ہیں سکون کا، شانتی اور آشتی کا، "منظر"

رہگزر، سائے، شجر، منزل دور، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ

اور آخر میں

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، "آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

اسی طرح کی نظم ہے "اشک آباد کی شام"

نظموں کا اس قسم کا مجموعہ یاد دلاتا ہے کہ

ے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا۔

فیض کے ہاں انداز بیان میں جو سلاست آگئی ہے وہ تکلم کے ردِم کے قریب آتی گئی ہے۔ خاص طور پر بلینک ورس میں فیض یوں چلتے ہیں۔ جیسے بول رہے ہوں۔ جیسے ایک پڑھا لکھا SOPHISFIATED مہذب شخص کلام کر رہا ہو۔ بلینک ورس ان کے ہاں آکر موم ہو گئی ہے۔

نظم میں فیض غزل کی ایک تکنیک کو خاص طور پر استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے ہم قافیہ، ہم ردیف مصرعے بڑی نظم میں اپنے گچھے بناتے چلے جاتے ہیں اس طرح وہ نظم میں غزل کے اجزا شامل کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح فیض کے مصرعوں کے اندر بھی ردِم کے پیٹرن (بحر یا وزن کی مناسبت سے علاوہ) پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً گیت "جب تیری سمندر آنکھوں میں" میں

یہ دھوپ کنارا، شام ڈھلے

......

جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل

اور پھر

ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک   وغیرہ وغیرہ

یا "رنگ ہے دل کا مرے" میں

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

اس نظم میں "رنگ" کی تکرار سے کام لیا گیا ہے۔

یہی خصوصیتیں "پاس رہو" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یا پھر "زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے" میں۔

ابھی تک فیض کی شاعری کا ذکر SYMCHROMIC (ہم وقتی) پہلو سے آ رہا تھا آیئے اب (DIACHRIMIC) انداز سے دیکھیں،

"دست تہِ سنگ" تک آتے آتے فیض کو شکایت ہونے لگی ہے کہ

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم

ماضی کا صیغہ استعمال ہونے لگا ہے۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے

اور

کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھئے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد

"پھر وادیٔ سینا" میں

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست نہ ناخنِ قاتل نہ آستاں پہ نشاں

"شامِ شہرِ یاراں" میں شاعر کو فرصت کے لمحے ملے ہیں تو وہ زندگی کی اسٹاک ٹیکنگ کرنے لگا ہے۔

ماضی یاد آنے لگا ہے، حالات دہرانے کی بات ہوتی ہے، دعا ہوتی ہے، موت کا

کیسے استقبال ہوگا، یہ موضوعات عام ہیں۔

بہار آئی تو جیسے یکبار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
چلو پھر سے مسکرائیں
چلو پھر سے دل جلائیں
اے شامِ مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو
نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
جس راہ چلے، جس سمت گئے
یوں پاؤں لہو لہان ہوئے
ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

اور پھر یہ خوبصورت نظم "جس روز قضا آئے گی" اس نظم کا احاطہ کرنا انتہائی ار کام ہے۔ اس میں فیض کی وہ تمام شاعری اور فنی صلاحیتیں بروئے کار ہیں جو ان شعر کو جمال کی بلندیوں پر پہنچاتی ہیں۔ شاعر قضا کو ایک قدرتی عمل کے طور پر ہی قبول

نہیں کرتا بلکہ ایک کامیاب زندگی کے ایک مناسب (FINAL) کے طور پر لیتا ہے موت ایسے آئے گی جیسے " اول شب رہ بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب / جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در / اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار / یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے "۔ شاعر موت کو شکر گزاری کے ساتھ قبول کرے گا۔ زندگی کے اقرار کی اس سے شدہ مثال کیا ہوگی کہ

دل سے بس ہوگی یہی حرفِ ودع کی صورت
للّٰلہ الحمد بانجام دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنام لب شیریں دہناں

" تم اپنی کر گزرو " میں بھی عمر کے آگے بڑھنے کا ذکر ہے :

اب کیوں اس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا

پھر وہی یادِ ایامِ گذشتہ :

یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا

اسی لئے :

تم خوف و خطر سے در گزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا

اور اب فیض کا نیا مجموعہ طباعت کی منزل سے گذر رہا ہے یا گذرنے والا ہے "شام شہر یاراں" کے بعد شاعر پہ قیامت گذر گئی جس کا ذکر نثر میں فی الحال ممکن نہیں۔ سنا ہے کہ خوبصورت کھنڈروں کے شہر بیروت میں یا سرعرفات کے ہیڈ کوارٹرز میں جب شام کے سائے دراز ہونے لگتے ہیں تو فیض بے چینی میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہاں انہیں کسی کی انتظار نہیں ہوتی کہ وہم ہو راہرو ہوگا۔ کہیں اور چلا جائیگا بلکہ اس کے برعکس،

پھر خیال سوئے وطن رواں ہے

فیض نے ایک بار کہا تھا۔

دل یہ کہتا ہے کہیں اور چلے جائیں جہاں
کوئی دروازہ عبث وا ہو، نہ بے کار کوئی
یاد فریاد کا کشکول لئے بیٹھی ہو۔

. . . .

یہ بھی کر دیکھا ہے سو بار کہ جب راہوں میں
دیس پردیس کی بے مہر گذر گاہوں میں
قافلے قامت و رخسار و لب و گیسو کے
پردۂ چشم پہ یوں اترے ہیں بے صورت و رنگ
جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ

لیکن شاعر کہتا ہے ؎

اور دل کہتا ہے ہر بار چلو لوٹ چلو
اس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دکھ بھی نہ ہو
یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی

اور اس صحن میں ہر سُو یوں ہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدیٔ دیدار بچھا ہے اب بھی

شاعر وطن سے دور کیسے رہ سکتا ہے جب کہ اس نے خود کہا تھا ؎

کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے
سکوں ملے نہ کبھی تیرے پا فگاروں کو
مجالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے

فیضؔ صاحب، آپ کتنے خوش نصیب ہیں کہ وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ میں کتنا بدنصیب ہوں کہ چاہتا ہوں آپ میں اور وطن میں فاصلہ ہی رہے تو ٹھیک ہے۔

عبداللہ ملک!

تیرہ فروری

آج ۱۳ فروری کی تاریخ ہے لیکن تاریخوں میں کیا رکھا ہوتا ہے تاریخیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، وہی روز و شب اور وہی یکسانیت، لیکن بعض تاریخیں اور بعض دن انسان کی یادوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں مینارہ نور کی مانند، شمع راہ کی طرح، اب ۱۴ اگست آخر ایک دن کا ہی نشان ہے، ایک تاریخ ہی تو ہے، لیکن کیا ہم اس دن کو اپنی یادوں سے محو کر سکتے ہیں، ہم یہ کیسے بھلا سکتے ہیں کہ اس دن یہ برصغیر آزاد ہوا تھا یا ایک عالم، نومبر کو یاد رکھتا ہے اس لئے کہ اس دن اس عالم دلفریب میں پہلا سوشلسٹ انقلاب بپا ہوا تھا، مجبور اور مقہور پابہ زنجیر انسانوں نے اپنی زنجیریں کاٹ ڈالیں، راز شاہی اور اس کے بعد سرمایہ داروں کی جمہوریت کا تختہ الٹ کر مزدوروں، کسانوں کا راج قائم کر لیا تھا اس کے بعد انسان کے شعور، اس کی یادوں میں یہ تاریخ سانس کی مانند رچ بس گئی، اسی طرح سے معمولی معمولی تاریخیں، عام دن بعض عظمتوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور پھر یہ دن شخصیتیں اور عظیم واقعات و انقلاب گڈمڈ ہو کر رہ جاتے ہیں مجھے یقین ہے کہ ۱۳ فروری بھی کچھ ایسا ہی دن بننے والا ہے اس لئے کہ یہ تاریخ یہ دن پاکستان کے عظیم شاعر فیض کی سالگرہ کا دن ہے۔

ہاں آج ۱۳ فروری ۱۹۸۱ء ہے۔

یہ فیض کا جنم دن ہے فیض آج ستر برس کے ہو گئے ہیں ویسے بہت سے لوگ

ستر برس کے ہو جاتے ہیں۔ اور کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی، لیکن فیض ستر برس کے ہوتے ہیں تو ایک عالم میں سترویں سالگرہ کا چرچا ہے اور دنیا کے اکثر شہروں میں لوگ فیض کی سالگرہ منا رہے ہیں ہاں یہ درست ہے کسی جگہ چوری چھپے، خاموشی سے، زیر لب اور ملکوں ملکوں میں تو یہ سالگرہ دھوم دھڑکے سے منائی جا رہی ہے اور قریہ قریہ اور شہر شہر میں سب اسی محبت اور نفرت کے عمل کے مظہر ہیں۔ ایک صف میں ان گنت مزدور کسان ان کے نام لیوا زندہ اور سولی پر لٹک جانے والے اور موت کے ہاتھوں جان ہار جانے والے شاعر، ادیب اور دانشور کھڑے ہیں۔ تو دوسری طرف مٹھی بھر حکمراں جو اہل زر کے نمائندے ہیں اور قلیل تعداد میں ہیں لیکن توپ رائفلنگ سے لیس ہیں۔

یہ صفیں دیس دیس میں بھی اور عالمی سطح پر بھی ترتیب پا رہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ہم فیض کی سالگرہ مناتے ہیں تو ہم ناظم حکمت ہوں، یا پابلونرودا ہوں، مخدوم محی الدین ہوں یا ترسوم زادہ ان سب کو یاد کرتے ہیں، سلام کرتے ہیں، کیونکہ فیض کی سالگرہ صرف ایک شاعر کی سالگرہ نہیں ہے کہ کسی مصنف اور صحافی کی سالگرہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمی مجاہد کی سالگرہ ہے جس نے زندگی کے سفر میں سے قریب قریب پچاس برس نئی دنیا کے لئے یا دوستوں دشمنوں کی زبان میں "سرخ سویرا" کے لئے جد وجہد کی، لیکن بدقسمتی سے اس سلسلے میں بعض دوستوں اور فیض کے مداحوں نے فیض کی شاعرانہ سرگرمیوں سے ہم آہنگ دوسری سرگرمیوں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ جیسے فیض ان سرگرمیوں کے لئے تیار نہ تھے لیکن یاروں نے ان کو ان میں گھسیٹ لیا مثال کے طور پر میرے پیارے دوست اور فیض کے جانثار ڈاکٹر ایوب مرزا نے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں لکھا ہے۔

" شاعر سخن شناس اور صاحب ذوق حضرات متفق ہیں کہ فیض دور حاضر میں دنیا کا بہت بڑا شاعر ہے، فیض کا فلسفہ مارکسٹ فلسفہ ہے، سیاست سے تعلق محض مارکسی نقطۂ نظر کی حد تک ہے یاروں نے گھسیٹ کر انہیں ٹریڈ یونین کا لیڈر بنا دیا تو یہ بن گئے،

آزاد پاکستان پارٹی کا دستور لکھوایا تو لکھ دیا اور انہوں نے اس دشت میں ہر خار دار راستے پر ہنستے کھیلتے صلیبیں اٹھائی ہیں۔

اب پیارے ایوب مرزا نے یہ پیراگراف لکھ کر فیض کی تعریف کی ہے یا بد تعریفی اولاً فیض شریف النفس ہیں، شریف الزباں ہیں کم گو ہیں لیکن وہ اپنے عزم کے پکے ہیں اگر ان کو کوئی راہ پسند نہ تھی تو کیا فقط یاروں دوستوں کے بہکاوے میں آ کر یہ سب کام کرتے رہے ہیں اور کیا ہم ان کی ان تمام سرگرمیوں پر پانی پھیر دیں اور جب ایوب مرزا ان کو مارکسسٹ تسلیم کرتے فیض کو آج ہدیۂ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے اور آج وہ کتنا مسرور و شادمان ہو گا، عمر کا حاصل اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ ایک عالم چاہنے والا ہو، پیار کرنے والا ہو، لیکن فیض نے بھی تو عمر بھر پیار کیا ہے۔

ما نقدِ عمر صرفِ رہِ یار کردہ ایم
کاری کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

ایسے سمے میں جب لوگ فیض پر عقیدت کے پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ اس کے شعر دل پر سر دھن رہے ہیں اس کی زندگی کی تابناکیوں سے اپنے سینہ و دل گرما رہے ہیں تو ایسے میں شریف النفس اور شریف الزباں فیض کے لئے کچھ فاشسٹ حلقے غیض و غضب کا اظہار بھی کر رہے ہوں گے اور جس طرح سے فیض سے محبت کرنے والے ایک عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح سے فیض سے نفرت کرنے والے، غیض و غضب کا اظہار کرنے والے صرف "نوائے وقت" تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ بھی ملک ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور سچ یہ ہے یہ محبت اور یہ نفرت ہی فیض کی عظمت کے راز ہیں۔ فیض سے محبت، اس سے پیار، اس کے اشعار پر سر دھننا اور دیس دیس میں اس کے شعری کلام کے تراجم کا ہاتھوں ہاتھ بکنا ایک بہت بامعنی، ایک شعوری اور قدرے فکری اور نظریاتی عمل ہے یہ ترقی جمہوریت امن اور انقلاب کے ساتھ ہم آہنگی کا اعلان ہے اور دنیا بھر کے مجبور و مقہور انسان

کشاں کشاں ان صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں
جیسے کچھ اختیار ہے گویا

ہاں تو جب فیض سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے دشنام اس کا مقدر بنتی ہیں اس کی حب الوطنی تشکیک کے زد میں آتی ہے اس کے خلاف غیض وغضب کا اظہار کیا جاتا ہے خود اسے ہی نہیں بلکہ اس کے دوستوں اور خانوادہ کو بھی دار پہ کھینچنے کا مطالبہ ہوتا ہے تو یہ بھی ایک بامعنی، شعوری، اور فکر عمل ہے اور اس کے ڈانڈے جن بین الاقوامی سامراج کی حامی فکری، تحریکوں اور زر دہ عادت سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ آج دیس دیس میں تحریکیں اٹھتی ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں، خانہ جنگیاں لڑی جاتی ہیں اور پھر انقلاب دوست اور انقلاب دشمن صفیں ترتیب پاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی جنگوں کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ تو یہ ہیں لو مارکسی فلسفے کی بنیاد ہی، اس کے اس قول پر ہے "فلسفی دنیا کے متعلق سوچتے ہے اصل کام تو اسے بدلنا ہے" اگر ہم دنیا کے عظیم شاعروں اور ادیبوں کی زندگی سے ان کی سیاسی سرگرمیاں اور جدوجہد کو حذف کر دیں۔ تو ان کی زندگی کی توانائیاں اور کیف بھی ختم ہو جاتا ہے بلکہ خود ان کے شعر بے معنی لگنے لگیں گے، اب ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں حب دیس دیس سے دانشور، شاعر، ادیب اور صحافی اُمڈے چلے آئے تھے اور انٹرنیشنل بریگیڈ کے پرچم تلے جنگجوں ہزاروں نے اپنی جان ہار دی تو کیا وہ بھی یاروں دوستوں کے بہکاوے میں آگئے تھے نہیں یہ ایک شعوری عمل تھا اور اسی عمل کی طرف ہسپانیہ کے بزرگ شاعر البرٹی جو اس وقت جوانِ رعنا تھا نے ان ادیبوں اور شاعروں کو مخاطب کر کے کہا تھا

تم دور دراز سے آئے ہو۔
لیکن تمہیں ان فاصلوں کی کیا فکر۔
تمہارا خون ان فاصلوں سے ماورا ہے۔

یہ خون سرحدوں سے بے نیاز ہے لیکن پھر بھی اس سے گیت پھوٹ رہے ہیں
دھرتی کے بارے میں، انسان سے متعلق۔
تم کسی دن، کسی رات، کسی لمحے۔
موت سے ہم آغوش ہو جاؤ گے۔
کون جانتا ہے کہ یہ موت تمہیں کہاں آئے؟
کس شہر میں، کس قصبے میں، کس گاؤں میں۔
کس کھیت میں اور کس سڑک کے کنارے۔
یہ سب شاید نامعلوم رہیں
لیکن جو گیت تم نے خندقوں میں بیٹھ کر۔
میڈرڈ کے خستہ مکانوں کی حفاظت میں کھڑے ہو کر۔
بنے ہیں جو شعر اس عالم میں تم نے کہے ہیں۔
وہ تو جانے جائیں گے، پہچانے جائیں گے۔
ان کی شناخت ہو گی۔
زندہ انسانوں کی طرح۔
عظیم مجاہدوں کی مانند۔

ہزار ہا شاعر، عظیم شاعر، انقلابی شاعر گزرے ہیں۔ اور آج بھی ہیں۔ جن کے شعر سیاست اور عملی جدوجہد کی کٹھالی سے کندن ہو کر نکلے ہیں اور فیض کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔ دراصل ہمارے ہاں درمیانے طبقے کی روایت نے شدت کے ساتھ جڑ پکڑ لی ہے جس کا شکار خود ترقی پسند، انقلابی اور اپنے کو مارکسی کہنے والے بھی ہو گئے ہیں کہ فلاں بہت عالم ہے، اچھا شاعر ہے لیکن سیاست نے اس کو کہیں کا نہیں رکھا۔ ابوالکلام کی عالمانہ عظمت کے معترف، لیکن اس کی سیاست سے اختلاف کرنے والے اٹھتے بیٹھتے یہی کہتے

بھے، لیکن عظمتوں کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ عالمانہ عظمتوں کو ایک عمل نہیں بلکہ درجنوں عوامل جنم دیتے ہیں اور یہ تمام عوامل مل کر جہاں ان شخصیتوں کو قرآن کی تفسیر لکھنے پر مجبور کرتے ہیں، غبار خاطر تصنیف کرنے اور تذکرہ جیسی خودنوشت سوانح تحریر کرنے پر اکساتے ہیں، وہی عوامل سیاست کی وادی خار زار میں بھی دھکیل دیتے ہیں، کیا اقبال کے اشعار اور ان کے سیاسی و سماجی افکار کو الگ کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا یہی سیاسی و سماجی افکار ان کو سیاست کی وادی خار زار میں نہیں لے گئے تھے یہ الگ بات ہوتی ہے کہ بعض عالموں کی پہچان علم اور ان کے علمی شہ کاروں کے حوالے سے زیادہ ہوتی ہے اور ان کی دوسری سیاسی اور سماجی سرگرمیاں پس منظر میں چلی جاتی ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض عالموں، محققوں، مصنفوں اور صاحب طرز ادیبوں کے تمام شہ کار، ان کی تحریریں، ان کی نگارشات ان کی سیاسی جدوجہد کی عظمتوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں برصغیر کی کئی شخصیتیں بہت ہی نمایاں ہیں۔ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو ہی لیجئے ایک عالم گاندھی جی کو ان کی سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے ہی فقط جانتا ہے۔ لیکن ان کی صحافت ان کی تحریریں ان کا فلسفہ یہ سب سیاست کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں، یہی حال پنڈت جواہر لال نہرو کا ہوا ہے حالانکہ پنڈت جی نے جو تصنیفات چھوڑی ہیں۔ وہ اپنے طور پر زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی، لیکن کیا یہ تمام تحریریں، یہ تمام افکار اور بہترین تاریخی تحقیق وجود میں آسکتی تھی اگر جواہر لال سیاست کی آتش سے تپ نہ رہے ہوتے کیا مولانا محمد علی کی صحافت اتنی جاندار ہوسکتی تھی اگر سیاسی سرگرمیوں اور سیاسی جانبداری اور سامراج دشمنی نے ان کو گرمایا نہ ہوتا، یہی حال مولانا ظفر علی کا ہے۔

اب انگولا کے پہلے صدر آنجہانی گستینو نیتو کی مثال ہمارے سامنے ہے تمام عمر سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہے گوریلا بنے، گوریلا فوج کی قیادت کی، لیکن شعر بھی کہے اور ایک عالم سے اپنے اشعار کے لئے خراج تحسین بھی حاصل کیا لیکن آج ایک عالم

یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان کے اشعار میں تمام کی تمام تپش ان کے جذبۂ آزادی اور انقلاب سے لگن کی وجہ سے ہے ورنہ وہ "بوڑھا حبشی" جیسی نظم کبھی نہ لکھ پاتا۔ یہ نظم آج بھی افریقہ کے انسانوں کو ہی نہیں بلکہ پوری تیسری دنیا جو سماجی انقلاب کے لئے برسرِ پیکار ہے کے خون کو گرماتی ہے۔

اس کی بولی لگ چکی تھی۔
پھر اسے جہازوں پر لاد دیا گیا۔
رکھوالوں اور چوکیداروں کے کوڑوں کی چھاؤں میں۔
بڑے بڑے شہروں میں اسے پیٹا گیا، ادھ موا کیا گیا۔
ایک ایک سکے کے لئے اسے ٹھگا گیا۔
تذلیل بدترین تذلیل اس کا مقدر بنی۔
شکست پے بہ پے شکست اس کے حصے میں آئی۔
اسے مجبور کیا گیا اطاعت پر۔
خدا اور انسان دونوں کی۔
تاآنکہ وہ کھو گیا۔
اس نے کھو دیا اپنا ملک۔
وہ اپنے کو بھی بھلا بیٹھا، کھو بیٹھا۔
وہ چیتھڑوں میں ملبوس رہا۔
انہوں نے اس کا اور اس کی روح کا مذاق اڑایا۔
کیونکہ یہ جسم اور یہ روح دونوں دونوں ہی ان کی روح اور جسم سے مختلف تھے۔
یہ بوڑھا سیاہ فام۔
چیتھڑے پہنے۔

زمانے کا دھتکارا ہوا۔
جو خلاؤں میں کھو گیا ہے۔
یہ دھجی دھجی لنگوٹ پہنے۔
وہ بڑبڑاتے ہیں — بیچارہ سیاہ فام۔
اور شاعر اس کو اپنا بھائی، اپنا رفیق بتاتے ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس موضوع پر خود فیض بھی واضح ہیں اور اسی لئے انہوں نے تمام عمر ہر جدوجہد میں پورے شعور کے ساتھ حصہ لیا ہے چنانچہ وہ "دست صبا" کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

"یوں کہئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے
گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر
ہے اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر اس کے بہاؤ میں دخل
انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔
اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔"

فیض نے ان تینوں کاموں کے لئے مسلسل اپنے مخصوص انداز میں جدوجہد کی ہے۔ چنانچہ خود ہی وہ اس ابتدائیہ میں اس تمام استعاراتی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"غالباً اس طویل و عریض استعارے کو روزمرہ الفاظ میں بیان کرنا غیر ضروری ہے مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔

فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔

یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اس لئے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں، اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ اس کوشش میں کامرانی یا

ناکامی تو اپنی اپنی توفیق اور استطاعت پہ ہے لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔"

اس لیے فیض کی اس کی جدوجہد خواہ وہ فنی ہو یا سیاسی، صحافتی ہو یا ٹریڈ یونین سے وابستگی سے متعلق ہو اسے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا چنانچہ جب وہ حسن یار کی بھی باتیں کرتا ہے تو وہ بے تاب ہوتا ہے کہ معاملات بہتر ہوں تاکہ یہ حسن اور نکھر آئے، تاکہ دل کی گرمی اور بڑھے رخسار یار اور دمکیں اور زلف یار اور پیچیدہ ہو۔

فیض جس وقت حسن یار کی باتیں کرتا ہے تو کون جوان دل ہے جو تڑپ نہ اٹھے اور جب وہ مجاہدہ کی بات کرتا ہے تو اس وقت بھی ان جوان دلوں میں وہ ایک حرارت ایک جدوجہد کا جذبہ ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ جب کہتا ہے۔

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

یہ باتیں میں نے ان سطور میں خاصی وضاحت سے کر دی ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ فیض کی عظمت ہی یہ ہے کہ وہ عملی جدوجہد سے وابستہ رہا ہے اور اسی وابستگی نے اس کے شعروں کو اس مقام پر پہنچایا ہے کہ ان میں ہر مجبور و مقہور اپنی کیفیت دیکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فیض کی شاعری پر جب تفصیل سے کام ہوگا تو وہ اس برصغیر کی ہی انقلابی تاریخ کی نشاندہی نہیں کرے گا۔ بلکہ عالمی سامراج دشمن تحریکوں کو سمجھنے کیلئے بھی یہ شاعری نشانِ راہ کا کام دے گی۔ اب افریقہ کی بیداری کے گیت وہی شاعر کہہ سکتا ہے جو افریقہ کی روح کو اس کے کرب کو، اس کے جذبہ حریت کو جانتا ہو اور محسوس کرتا ہو چنانچہ فیض نے سالوں پہلے کہا تھا۔

آجاؤ میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
آجاؤ افریقہ
پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
آجاؤ افریقا

فیض کے بارے میں دراصل ابھی بہت کام ہونا ہے فیض کی شاعری ہماری تاریخ کا ہمارے عوام کی جدوجہد کا بہت بڑا ماخذ اور SOURCE ہے چنانچہ یہ سمجھنا کہ فقط کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھ کے ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے، یہ پوری حقیقت نہیں کیونکہ کمیونسٹ مینی فیسٹو تو فیض کے علاوہ بھی اس دور کے کئی دانشوروں نے پڑھا تھا لیکن ان میں کوئی بھی فیض نہیں بن سکا اور سچ یہ ہے کہ خود ان کے استاد، اور وہ گروہ جس کے حوالے سے وہ مدتوں جانے جاتے رہے، ان میں کوئی بھی کوئے یار سے سوئے دار روانہ نہ ہوا، آخر کیوں؟ اس لیے فیض کی ابتدائی شاعری نقش فریادی سے لے کر آج تک فیض کی سوچ اور فکر میں جو تسلسل ہے وہ اس کو نظریے اور عمل کی ہم آہنگی نے عطا کیا ہے۔ یہی عمل اور نظریے کی ہم آہنگی ہی تو تھی جو ان کو اگر آزادی سے پہلے فاشزم سے لڑنے کے لیے برطانوی فوج کی ملازمت میں لے گئی تو اسی ہم آہنگی نے ان کو ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ ہونے پر مجبور کیا، وگرنہ جب وہ پوسٹ مین یونین کے صدر چنے گئے اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر تو اس وقت وہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ اب ایسے میں ان مجبوروں اور مقہوروں کی تحریکوں سے اپنے کو وابستہ کرنا ہی اصل مارکسزم تھا اور انہی وابستگیوں سے

اسنے زندہ رہنا سیکھا۔ دکھوں کے سامنے سینہ سپر ہونا سیکھا اور مایوسیوں میں امیدوں کے چراغ جلائے رکھنے کا سلیقہ آیا چنانچہ یہی اس کی وابستگیاں اس کی شاعری کی جان ہیں اسی لئے تو وہ کہتا رہتا ہے۔

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور جب اس پر نظریہ پاکستان کے مخالف ہونے کے تیر برسائے جاتے ہیں، جب اس کی حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ طلب کیا جاتا ہے تو وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے۔
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

وہ یہ بھی جانتا ہے۔

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

لیکن وہ مایوس نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

نذرانہ

قتیل شفائی

آج کی شام فیض کے نام

اب تک تیری یادوں کی مے چھلک رہی ہے جام بہ جام
اے ہم سب کے بچھڑے ساتھی، آج کی شام ہے تیرے نام

تو نظروں سے دور ہے لیکن کسی کے دل سے دور نہیں
دھڑکن دھڑکن پہنچ رہا ہے تیری چاہت کا پیغام

چاپ تیرے لفظوں کی اب تک صاف سنائی دیتی ہے
اب بھی تیرے پیار کا سایہ مہک رہا ہے گام بہ گام

تو نے وطن سے دور بھی گائے گیت وطن کی عظمت کے
تیرے حصّے میں آئے ہیں پھر بھی رقیبوں کے دشنام

تو نے اپنے فن کا مرہم رکھا زخمی حرفوں پر
لیکن کچھ ناحرف شناسوں نے چھینا تیرا آرام

ظالم لوگوں نے لکھے جو اپنے دل کی کالک سے
تیری ایک خموشی نے دھو ڈالے وہ سارے الزام

بے انصافی کی اس رو کو ختم بھی ہونا ہے آخر
ہر آغاز کا پیچھا کرتا رہتا ہے اس کا انجام

ستر سال کی عمر تیری پھیلی ہے ستر صدیوں پر
لوح و قلم کے مالک نے لکھا ہے تیرے لئے دوام

فیض ترے مداحوں میں شامل اک شخص قتیل بھی ہے
جانے اس کو ملتا ہے ان سنگ زنوں سے کیا انعام

کشور ناہید

زمیں محبت ہے تیرم دم سے

زمین محبت ہے جس کے خوں میں
وہ اپنے ہی دیس سے نکلنے کی داستاں ہے
وہ جس کے شعروں میں غم عیاں ہے
وہ جس کے ہونٹوں کے نام کردوں
حلاوتوں کے سبھی زمانے
محبتوں کے سبھی فسانے
وہ جس نے ہر قامتِ ستم کو
قرینۂ حوصلہ سمجھ کے
تو اب آئندگاں کے کشکول
کی عطا جان کے کہا تھا
کہ صبر کے دن
بہت ہی تھوڑے، بہت ہی کم ہیں
میں کیسے مانوں
کہ میری ساری ریاضتوں میں
شکستِ سازِ شبِ مسلسل

نہ بار پائے
میں اپنے گھر میں بطور قیدی ہی دن گزاروں
میں اپنے کھیتوں میں چل چلاؤں
مگر نہ رزق زمین پاؤں
میں اپنے دیوار و در کی چھاؤں میں
دشمن وطن کو فراغ ماؤں

فیض کی موت پر اُستاد دامن کے اشعار

ایہہ دُنیا مثل سراں دی اے — تے مسافراں بیٹھ کھلو جانا
واری واری لے ساریاں کوچ کرنا — آئی وار نہ کسے اٹکو جانا
میرے وہندیاں وہندیاں کئی ہو گئے — تے میں کیتاں دسے وہندیاں ہو جانا
دامن شال دوشالے لیراں والیاں نے — بھناں خاک دے وچ سمو جانا

سرمد صہبائی

کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے

(نذرِ فیض)

کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے
رات کے شہر میں مہتاب کی عریانی میں
مخملِ خواب لئے، ہالۂ آغوش لئے
ابرِ رفتار لئے، قامتِ زرپوش لئے
جلوۂ رنگِ حنا، عطرِ ملاقات لئے
ہجر کی رُت میں ملے وصل کی سوغات لئے
کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے

کیا خبر ہم سے ملے
ماتمِ گل میں کہیں موسمِ افسوس لئے
اشکِ محروم کی دھندلائی ہوئی اوس لئے
شہر در شہر ملے اپنی تنہائی میں
جشنِ تعزیر میں یا جلسۂ رسوائی میں

کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے

کیا خبر صبحِ سفر ساحلِ رخصت پہ ملے
چشمِ بینا سے پرے منزلِ حیرت پہ ملے
جانے اب کونسی مہلت پہ ملے
کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے
جانے کس آن میں کس موجِ جنوں میں آئے
عکسِ خورشید لئے شیشۂ خوں میں آئے

کیا خبر ہم سے ملے
ہر رگِ جاں میں تڑپتے ہوئے دم لیتے ہوئے
تختۂ دار کی بانہوں میں جنم لیتے ہوئے
کیا خبر ہم سے ملے
ہم سے ملے وہ نہ ملے

فہمیدہ ریاض

تہنیت

یہ مرحلہ بوئے گل سا نازک
یہ ساعت عرق سال و مہ کا
یہ وصلِ مدام کی گھڑی ہے

اے دردِ بدوش خانہ برباد
جادہ نہ ترا، نہ کوئی منزل
جز دیدۂ آب گوں وطن کے
جز خلقِ وطن کا خونچکاں دل

ڈالے ہیں جہاں جہاں پڑاؤ
تھیں خیمہ فگن وہیں نگاہیں
مانندِ نفس پلٹ کے آئیں
اس مجلس میں تری صدائیں

تم سُرخ محل میں آبراجے
بے سود رہی نگاہ داری

تھا پرزۂ شعر، پرزۂ جاں
پروا نہ حقِ راہداری

اب یُوں ہے کہ ہر عدو سے محفوظ
باہر شبخوں کی دسترس سے
مامون حصارِ عاشقاں میں
تم منزل پا چکے ہو کب کے

"اب آؤ نہ جاؤ گے کہیں تم"
اے در بدری میں رشکِ انجم
کیا سخت علیم پر پڑی ہے
یہ وصلِ مدام کی گھڑی ہے

اک بک فیض دے چشمے چوں

سنتو بھائی

پنڈا آس دا کنمبنی چھڈ دیوے تے میں قابو وچ خوف دا مرض کر لاں
سخن وراں دی اکھ بچا کے تے شاعر اپنے آپ نوں فرض کر لاں
ویکھاں چک کے بھار صلیب والا، ہولا کجھ تے ساہنوں دا قرض کر لاں
چشمے فیض دے چوں اک بک بھر کے، کوئی سن داہووے تے عرض کر لاں

پے گئی شام شریکاں نے کنڈ کیتی، لال کالے دی ساتھوں پچھان مک گئی
گل سوچاں تے آن ویران ہوئی، سوچ ہوٹھاں تے آئی زبان مک گئی
داستان گو دے منہ چپ لگی، اسی سمجھ بیٹھے داستان مک گئی
ٹھنڈے چلھے دی پھوکنی وانگ ساڈے ساہ آندے تے جاندے رہے جان مک گئی

آئی رات تے رات دے نال آئے، جیہڑے آوندے نیں نت ہنیریاں وچ
گو ڈار کھدے پت پلیٹیاں تے، آن بیٹھدے عشق بنیریاں وچ
درج سعداں دے بہت پھواڑ پاندے جدوں ہوندی اے سانجھ لٹیریاں وچ
زور پلدا اے نت کمزوریاں تے، کمزوریاں میریاں تیریاں وچ

کھلے اکھ تے نال خیال جاگے، کیوں نیندراں نے جھوکاں لائیاں نیں
آوے عقل تے سوچ سوال بن جائے سب سوچاں دے ہتھ خدائیاں نیں
ہوئے جیہے تے پیار دے سکھ ونڈے ہن تھوڑیاں ہور جدائیاں نیں
"ہوجے فجر تے آکھیے بسم اللہ اج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں"

فیض احمد فیض

منّو بھائی

(۱)

دیوا آس دا بلے ہنیریاں وچ
نویں فجر دا سانوں یقین دیوے
کجھ رحمتاں عرش دی مہربانی
کجھ نعمتاں سانوں زمین دیوے

(۲)

باس مٹی دی، روپ گلاب والا
ہتھ قلم دا، مکھ کتاب والا
مزہ شہد دا، ڈنگ عذاب والا
وچ شوق دے نشہ شراب والا

(۳)

چُپ، رات نالوں مہربان جیہڑی
سُخن، سخر دوپہر دے نور ورگا
مینہ جیٹھ دا، دھپ سیال والی
چھاں لوہڑ دی، میوہ کھجور ورگا

(۴)

عقل عاشقاں، سوچ دیوانیاں دی
فکر ماپیاں، بھول ایانیاں دا
پینڈے ندی دے، ڈونگھ سمندراں دی
سفر تھلاں دے، صبر مہانیاں دا

(۵)

وعدہ شیریں دے نال فرہاد والا
تاہنگ عشق دی بہت سرور والی
چولا یوسف دا، نین یعقوب والے
نعرہ حق دا، ضد منصور والی

(۶)

انہاں وچوں جے اک وی ملے نعمت
ساڈی شان نوں کل جہان من جائے
ایہہ نعمتاں کٹھیاں ہو کے تے
کدی فیر وی رون تے فیض بن جائے

حسن عباس رضا

"تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے"

نذرِ فیض

وطن بدر کسی دشمن کو بھی خدا نہ کرے
کہ اپنا گھر، گلی کوچے، فصیل، بام و سقف
مثالِ جنّتِ گم گشتہ یاد آتے ہیں
وہ شہرِ قاتل و دلدار جس کے رستوں پر
بدن دریدہ اسیرانِ پا بجولاں نے
تمام عمر گزرنے کی خواہشیں کی تھیں
اُسی بلادِ تمنّا کی مہوشوں کے نام
سلام یارِ دلِ آزردہ کا پیام لئے
"قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے"
اور ایک بار نہیں، بار بار گزری ہے
"تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے"

۲

بنامِ یارِ غریبُ الدّیار لکھیں گے
کہ جو ستم، کسی قاتل صفت کی قسمت تھے
ہر اِک گھڑی، وہ ستم ہم پہ ڈھائے جاتے ہیں
کبھی جو تذکرۂ لیلائے وطن چھیڑیں
تو ہم پہ کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں
صلیبِ شہر تو خوں رنگ ہو چکی، لیکن
خطیبِ شہر کے ارماں ابھی ادھورے ہیں
لبوں پہ مہرِ خموشی، قلم پہ قدغن ہے
جو حرفِ حق و صداقت زبان پر لائیں
تو شہر یار کی چتون پہ گرہیں پڑتی ہیں
مگر، قلم کی قسم، ہم سے سرپھروں نے کبھی
کسی یزید صفت کو نہ معتبر جانا
نہ دستِ غاصب و قاتل پہ ہم نے بیعت کی
نہ تخت و تاجِ شہی پر کوئی قصیدہ لکھا
جو منظر آنکھ سے دیکھا، رقم کیا ہم نے
"اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے"
اور ایک بار نہیں، بار بار گزری ہے
تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے"

۳

کتاب و حرف کے سا ونت پاسبانو، لکھو
لکھو، کہ حرفِ صداقت کبھی نہیں مرتا
کہو، کہ جاگتی آنکھوں میں خواب زندہ ہیں
لکھو، کہ پرچمِ پرّاں کبھی نہیں جھکتا
کہو، کہ اپنا قلم ہم کبھی نہ بیچیں گے
لکھو، کہ ہم نہ کریں گے ضمیر کا سودا
کہو، کہ "تیرِ ستم" ہو کہ دشنۂ یاراں
"جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں"
کہو، کہ نے بھی میسّر تھی، گُل بھی تھے، وہ بھی
پر ایک سبز قدم شپرک کی دہشت سے
"عجیب رنگ میں ابکے بہار گزری ہے
چمن سے صبا سوگوار گزری ہے
"تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے"

تین آوازیں

ظالم

جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو

ساری ژ فلسفوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خودسروں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے

اب نہ لٹکے گی کسی شاخ سے پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے

اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے

میرا مسلک بھی نیا راہِ طریقت بھی نئی
میرے تانون بھی نئے، میری شریعت بھی نئی

اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سرو قد مٹی سے بوٹوں کے قدم چومیں گے
فرش پر آج درِ صدق و صفا بند ہوا
عرش پر آج ہر اک بابِ دعا بند ہوا

مظلوم

رات چھائی تو ہر اک درد کے دھارے چھوٹے
صبح پھوٹی تو ہر اک درد کے ٹانکے ٹوٹے
دوپہر آئی تو ہر رگ نے لہو برسایا
دن ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا

یا خدا یہ مری گردانِ شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

سرودِ غیب

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمِّ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

سمرقند سن ۷۹ء

اردو ترجمہ غزل نمبر ۲

سننے کو بھیڑ ہے سر محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی

رندوں کے دم سے آتش مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی

آباد کر کے شہر خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغ ستمگر لگی ہوئی

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میان قاتل و خنجر لگی ہوئی

«سر [illegible] مرا هست [illegible] حکیم [illegible]
[illegible] عشق [illegible]»

[illegible]

فیض احمد فیض

نذرِ حافظؒ

دل شکنی بھی دلداری بھی
یادِ وطن کچھ اس سے زیادہ
شمعِ بدن فانوسِ قبا میں
خوبیٔ تن کچھ اس سے زیادہ
عشق میں کیا ہے غم کے علاوہ
خواجۂ من کچھ اس سے زیادہ
قندِ دہن کچھ اس سے زیادہ
لطفِ سخن کچھ اس سے زیادہ
فصلِ خزاں میں مشکِ بہاراں
برگِ سمن کچھ اس سے زیادہ
حالِ چمن پر تلخ نوائی
مرغِ چمن کچھ اس سے زیادہ

"ناصح گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق
گفتم اے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں" (حافظ)

بیروت ۱۹۸۰ء

فیض احمد فیض

منظر

دن ڈھلا کوچہ و بازار میں صف بستہ ہوئیں
زرد زرد روشنیاں
ان میں ہر ایک کے کشکول سے برسیں رم جھم
اس بھرے شہر کی ناسودگیاں
دور پسِ منظرِ افلاک میں دھندلانے لگے
عظمتِ رفتہ کے نشاں
پیشِ منظر میں کسی سایۂ دیوار سے لپٹا ہُوا
سایہ کوئی
دوسرے سائے کی موہوم سی امّید لئے
روزمرّہ کی طرح
زیرِ لب
شرحِ بے دردیٔ ایّام کی تمہید لئے
اور کوئی اجنبی
ان روشنیوں، سایوں سے کتراتا
ایک بے خواب شبستاں کی طرف جاتا

پیرس، اگست ۱۹۸۰ء

فیض احمد فیض

ترانہ

اُٹھ اُتاں نوں جٹا
مردا کیوں جانیں
بھولیا توں جگ دا اَن داتا
تیری باندی دھرتی ماتا
توں سب دا پالن ہار
تے مردا کیوں جانیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹا
مردا کیوں جانیں
جرنل، کرنل، سوبیدار
ڈپٹی، ڈی سی، تھانیدار
سارے تیرا دِتا کھاون
توں جے نہ بیجیں تے جے نہ گاہویں
بُھکے بھانے سب مر جاون
ایہہ چاکر توں سرکار
تے مردا کیوں جانیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹا
مردا کیوں جانیں

وچ کچہری، چونکی، تھانے
ایہہ ان بھول تے کیہہ سیانے
سارے کھجّل خوار
تے مردا کیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں جبٹّا
مردا کیوں جائیں
اِکا کر کے ہو کے کٹھّے
بُھل جا رانگڑ، چیمے، چٹھّے
سمجھے اِک پریوار
تے مردا کیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں جبٹّا
مردا کیوں جائیں
جے چڑھ آدن نوجواں والے
توں وی چھیڑ ہاں لمب کرالے
تیرا حق تیری تلوار
تے مردا کیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں جبٹّا
مرے اللہ ہور دی ہار
مردا کیوں جائیں

ہسکو ہسپتال
جولائی ۱۹۸۰ء

بخش لائلپوری۔ لندن

آہ! فیض احمد فیض

لوحِ اردو پہ درخشندہ رہے گا برسوں
بعد مرنے کے بھی وہ زندہ رہے گا برسوں
اک مسیحا جسے ہر زخمِ جگر نے ڈھونڈا
اک ستارا جسے تنویرِ سحر نے ڈھونڈا
اک ناقد جسے میزانِ نظر نے ڈھونڈا
ایک منزل جسے یارانِ سفر نے ڈھونڈا
لبِ خاموش کو اک طرزِ فغاں دی جس نے
کان بہرے کو تو گونگے کو زباں دی جس نے
جس نے چاہا کہ گلستاں میں بہار آجائے
زرد کلیوں پہ تبسم کا نکھار آجائے
اُجڑے لبوں کو تکلم کا شعار آجائے
دلفگاروں کو تڑپنے سے قرار آجائے
نغمۂ شوق نئے رنگ میں گانے والا
سو گیا خود ہی تہہِ خاک جگانے والا
قلزمِ شعر میں ہلچل سی مچا دی جس نے
فکر و فن کی نئی بنیاد اُٹھا دی جس نے
بندِ اذہان کو اک تازہ ہوا دی جس نے
مجلسِ شہر کی دیوار گرا دی جس نے
اُسے انسان کہو یا کہ فرشتہ لکھو
نظمِ اردو کے مقدر کا نوشتہ لکھو

تصاویر



فیض کے استقبال کے موقع پر عبداللہ ملک اور مظہر علی خاں۔



لینن پرائز حاصل کرنے کے بعد واپس آنے پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر استقبال
امتیاز علی تاج عبداللہ ملک ۔ فیضؔ اور مظہر علی خاں نمایاں ہیں ۔



۲۸ برس پہلے کی ایک تصویر جیل سے رہائی پر ایک تقریب کے موقع پر لی گئی -
فیض احمد فیض، سید امجد حسین اور عبداللہ ملک کے ہمراہ -



لندن میں فیض احمد فیض مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ اور افتخار عارف کے ساتھ ۔



فیض تاشقند میں افریقی اور ایشیائی ادیبوں کے ایک گروپ کے ہمراہ جن میں حکیم سعید عصمت چغتائی،
اور سردار جعفری نمایاں ہیں ۔



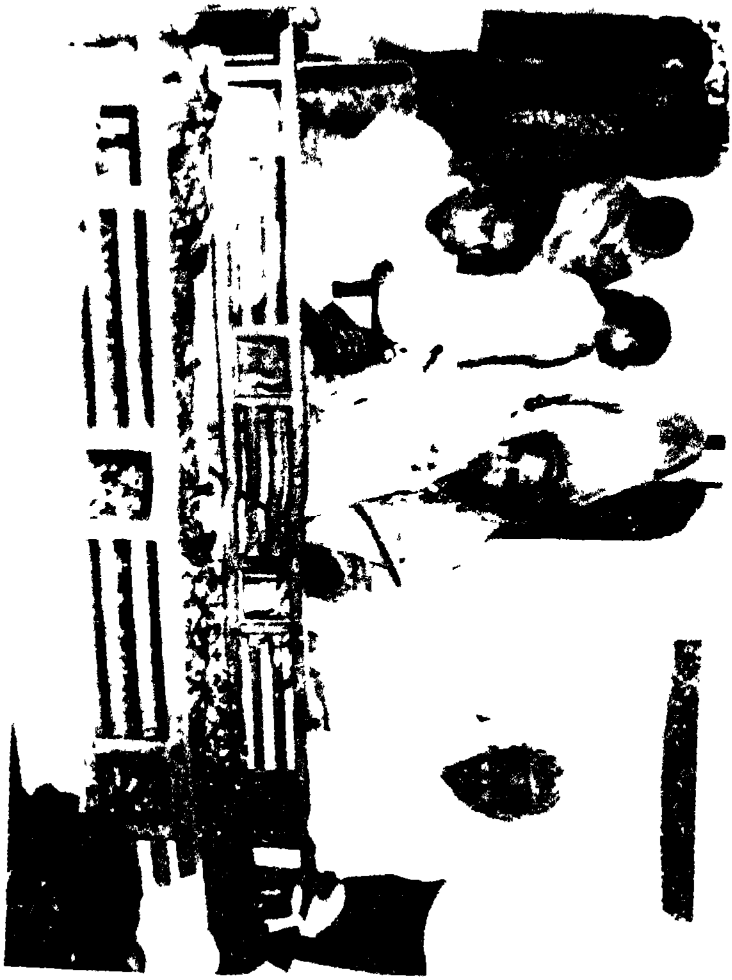
سندھ میں فیض کی سترویں سالگرہ کی تقریب زیر صدارت ضیاء محی الدین، زہرہ نگاہ
اور افتخار عارف کے ہمراہ بیٹھے ہیں اور فیض احمد فیض تقریر کر رہے ہیں۔



فیض احمد فیضؔ ازبکستان کے مشہور ادیب شرف رشیدوف فرسٹ سیکرٹری ازبکستان کمیونسٹ پارٹی اور
قازقستان کے ادیبوں کی انجمن کے صدر انور علیم جان اور کرغیزیہ کے مشہور ناول نگار چنگیز عظمتوف کے ہمراہ۔



فیض احمد فیض ایلکس لگوما سیکرٹری جنرل ایفروایشی رائٹرز جنوبی افریقہ کے مشہور ناول نگار کے ہمراہ۔



فیض احمد فیض کی میت کے سرہانے استاد دامن اور عبداللہ ملک بیٹھے ہیں



عبداللہ ملک، منو بھائی اور دوسرے دوست فیض احمد فیض کی میت کو ان کے گھر سے باہر لا رہے ہیں

دنیائے عرب ہو یا سیاہ فام جیالوں کا برِ اعظم افریقہ

یا پھر ایشیا اور لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک ہوں

غرضیکہ تیسری دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک ایک ہی عمل سے دوچار ہیں کہ

فوج اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کر رہی ہے!

آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب

عبداللہ ملک

اپنی نئی کتاب

فوج اور اقتدارِ اعلیٰ

(ابتدائی بحث)

میں دیتے ہیں

ان صفحات میں عبداللہ ملک نے قدیم سماج سے لے کر موجودہ دور تک کا احاطہ کیا ہے اور ان سوالوں کا جواب تلاش کیا ہے

— کیا حکومت و ریاست ازل سے تھیں؟

— حکومت اور ریاست کے مختلف اداروں — فوج، عدلیہ، انتظامیہ نے کب جنم لیا؟

— فوج کی اہم خصوصیات کیا ہیں جو اسکو اقتدار پر قبضہ کے لائق بناتی ہیں؟

اور پھر — تیسری دنیا کیا ہے؟

— دوسری دنیا اور پہلی دنیا کونسی ہیں؟

قیمت: ۳۵ روپے

اور ہم تیسری دنیا کے بسنے والوں کا مقدر

فوج کا اقتدار کیوں ہوتا ہے —؟

کوثر پبلشرز

۱۳۴ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور ۱۶

فون — ۸۵۱۴۰۰